دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۰۹	صفر المظفر ۱۴۴۷ھ مطابق اگست ۲۰۲۵ء	شمارہ: ۸

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند	مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند - ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.: 2133/57
Vol. No. 109, Issue No. 8, August 2025 अगस्त 2025
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 50/=	Annual Subscription Rs. 500/=

Annual by Regd Post. Rs. 700/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۱۵۰۰ روپے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپے

فہرست مضامین

حرف آغاز		محمد سلمان بجنوری	۳
تحقیقی مقالات	اصولِ فقہ حنفیہ پر اشکالات کا منصفانہ تجزیہ	مولانا عبید الرحمٰن	۵
//	ولادت نبوی ﷺ کے وقت روم کی		
	مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی حیثیت	ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی	۱۵
رہنمائی	اوقاف کا تحفظ اور ہماری ذمہ داریاں	مفتی تنظیم عالم قاسمی	۳۱
//	مائیکرو فنانس یعنی چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی...	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۳۸
	سلف صالحین اور استاذ کا ادب	مولانا عصمت اللہ نظامانی	۴۶
	پڑوسی کے حقوق	مولانا محمد راشد شفیع	۵۳

ختم خریداری کی اطلاع

- ○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ● ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ● ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/700 روانہ فرمائیں۔
- ● ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

محمد سلمان بجنوری

آج کل مدارس کی دنیا سے نکلے ہوئے ایک شخص نے صحابۂ کرامؓ کے موضوع پر، تمام اہل حق کے قلوب کو جس طرح زخمی کر رکھا ہے، وہ ایسا بدترین معاملہ ہے جس کی کوئی نظیر ملنا مشکل ہے۔

حالانکہ یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ روافض، اپنی مجالس اور تحریروں میں اس سے زیادہ دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہیں؛ لیکن اس انداز سے کھلم کھلا چیلنج بھرے انداز میں گستاخی کی جسارت شاید وہ بھی نہیں کر پاتے ہیں، پھر یہ کہ وہ معلوم طور پر ایک باطل مذہب اور مستقل و متعین فرقہ ہے، جب کہ مذکورہ شخص بظاہر اہل سنت کا حصہ رہا ہے اور اب تک بھی وہ اسی کا دعویٰ یا ناکام مظاہرہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے؛ حالانکہ اس شخص کے منہ سے نکلنے والی اکثر مغلظات، شیعوں ہی کا پس خوردہ معلوم ہوتی ہیں۔

مزید یہ کہ یہ شخص چوں کہ اب تک اپنوں میں شامل رہا ہے اس لیے اس سے تعلق یا تاثر رکھنے والے یا اس سے پڑھے ہوئے بہت سے لوگ اس کی باتوں کو اس طرح لے رہے ہیں جیسے اپنے ہی کسی آدمی کی باتوں کو لیا جاتا ہے ایسے لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ آدمی شاید کوئی تحقیقی بات کر رہا ہے یا اس کی بات میں کچھ نہ کچھ وزن ہے؛ حالانکہ یہ درحقیقت کم علمی اور ناپختہ ذہن کی کارفرمائی ہے، بہرحال کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ اس شخص کے ذریعہ گمراہی پھیلنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔

ایسی صورت حال میں تمام اہل حق کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس فتنہ کی روک تھام کے لیے اپنا کردار ادا کریں، واقعہ یہ ہے کہ اب یہ معاملہ ایک فرد کا نہیں رہا ہے اس لیے کہ تشکیک وارتیاب کے اس دور میں شیطان، باطل خیالات کو جلدی سے مزین کر دیتا ہے اور لوگ اس سے متاثر ہو جاتے ہیں، پھر یہ معاملہ کسی ایک مسئلہ کا نہیں؛ بلکہ پورے دین کے اعتبار و اعتماد کا ہے، اس لیے کہ اگر صحابہؓ پر سے اعتماد ختم ہو جائے یا کمزور پڑ جائے تو دین پر اعتماد باقی رہنا ممکن نہیں رہتا، حقیقت یہ ہے کہ رفض

وشیعیت کی شکل میں جوفتنہ، دورصحابہ میں برپا کیا گیا تھا اس کا اصل نشانہ یہی تھا کہ دین اسلام سے اعتماد اٹھادیا جائے۔

پھر دورِ تابعین ہی سے تمام اکابر امت، ائمہ مجتہدین، فقہاء ومحدثین نے اپنے طرز عمل سے واضح طور پر یہ پیغام دے دیا کہ وہ یہودیت کی اس سازش کو سمجھتے ہیں؛ چنانچہ انھوں نے طے کردیا کہ صحابہؓ کے سلسلے میں کوئی منفی بات قبول نہیں کی جائے گی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر، ائمہ اربعہ، نیز اس دور کے اور بعد کے تمام رہنمایانِ امت کے اقوال پر آپ نظر ڈال لیں سب کا خلاصہ یہی نکلے گا کہ صحابہؓ کا مقام محفوظ ومتعین ہے اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ کرنا جائز نہیں ہے، نہ تو صحابہ کرامؓ کے مشاجرات واختلافات کے بارے میں کوئی بات کی جائے گی اور نہ ان میں سے بعض سے صادر ہونے والی کسی غلطی کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اُن کا تذکرہ صرف خیر کے ساتھ ہی کیا جائے گا۔ لہٰذا جو لوگ صحابہؓ کی غلطیاں یہ کہہ کر بیان کرتے ہیں کہ یہ صحیح روایات سے ثابت ہیں وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ بالفرض اگر کوئی بات صحیح روایت سے ثابت بھی ہو تو اس کا بیان کرنا جائز نہیں ہے اور اگر غیر معتبر اور باطل چیزیں بیان کی جارہی ہیں تو یہ بلاشبہ اپنا انجام خراب کرنے کا راستہ ہے۔

اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو تو ان سطور میں ممکن نہیں ہے، سردست صرف اسی ضرورت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ گمراہی عام ہونے سے پہلے اس کی روک تھام پر توجہ کی ضرورت ہے، جو ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

* * *

اصولِ فقہ حنفیہ پر اشکالات کا منصفانہ تجزیہ

از: مولانا عبید الرحمٰن
دارالافتاء والارشاد، مردان

علوم وفنون کی دنیا میں عموماً اور فقہ واصول فقہ کے باب میں خاص طور پر مباحثہ ومناقشہ کا ہونا کوئی نئی بات نہیں، اس سے بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ فقہ حنفی کا حال ہے، اس کی تو گویا خمیر ہی میں بحث ومناقشہ ودیعت رکھی گئی ہے، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے گراں قدر تلامذہ کی روایت یہی رہی کہ وہ اپنے شرکاء درس اور تلامذہ کے ساتھ جی بھر کر مسائل واحکام میں بحث ومباحثہ کرتے، فقہی مسائل کے دلائل اور استدلالات پر مناقشہ کرتے رہتے۔

تاہم ان مناقشات کا مقصد حق بات تک رسائی حاصل کرنا تھا، دور اخیر میں بعض ایسے مناقشات کا بھی رواج ہونے لگا جن کے اسلوب سے ہی واضح ہو رہا تھا کہ حق تک رسائی مطلوب نہیں؛ بلکہ پہلے سے حق وباطل کا فیصلہ کرنے کے بعد ایک موقف کی تردید کے لیے مناقشہ کرنا مقصود ہے، پھر تردید بھی اگر اچھے جذبے اور مناسب اسلوب میں ہو تو کوئی بُرا نہیں ہے؛ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہاں ان مناقشات میں یہ دونوں چیزیں مفقود نظر آتی ہیں۔ اس نوعیت کے نامناسب مناقشات کی قدیم مثال شیخ ابن ابی العزمرحوم کی بعض کتابیں ہیں اور احناف کے اصول فقہ کے متعلق اس کی معاصر مثال فاضل جناب شیخ ثناء اللہ زاہدی کی کتاب ''ثواقب الانظار علی نور الانوار'' ہے۔

''ثواقب الانظار'' کا اجمالی تعارف

شیخ ثناء اللہ زاہدی صاحب کی اس کتاب کا پورا نام ''ثواقب الانظار علی نور الانوار'' ہے، یہ مناسب ضخامت کی حامل دو جلدوں میں تقریباً نوسو (۹۰۰) صفحات پر مشتمل کتاب ہے جو جامعہ اسلامیہ، صادق آباد سے معیاری انداز میں مطبوع ہے، کہنے کو تو یہ نور الانوار کی شرح یا اس کی تعلیقات ہیں؛ لیکن درحقیقت یہ نور الانوار؛ بلکہ اصول فقہ احناف کی ایک مکمل تردید وتنقید ہے۔

فاضل مؤلف کا منہج یہ ہے کہ اوپر متن کے طور پر نورالانوار کی عبارت نقل کرتے ہیں، نیچے حاشیہ میں اس پر تعلیقات لکھتے ہیں، ان تعلیقات میں حلّ کتاب کا پہلو بہت ہی کم؛ بلکہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، متن کی بات کو کمزور کرنا اور اس پر مختلف دلائل قائم کرنا اصل مطمح نظر محسوس ہوتا ہے، متن کی بحث کی مناسبت سے حنفیہ کے دیگر اصول ومسائل پر بڑے ہی فراخ دلی کے ساتھ ردود ونقود فرماتے رہتے ہیں، انداز تنقید بعض جگہ علمی معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اکثر جگہ اسلوب نگارش حد اعتدال سے متجاوز اور بہت ہی متجاوز محسوس ہوتا ہے، حنفیہ کے اصول وقواعد کی تردید وتنقید میں فاضل مؤلف بہت ہی سخاوت سے کام لیتے ہیں۔

حنفیہ کے حوالہ سے فاضل مؤلف کے جذبات

حنفیہ کے ساتھ فاضل مؤلف کے جذبات کی نوعیت کیا ہے؟ یوں تو یہ پوری کتاب اس بات کا پورا پورا آئینہ دار ہے کہ وہ حنفیہ کے خلاف غیر معمولی تعصب کا شکار ہیں۔ یہ کتنی ہی عجیب بات ہے کہ نصوص میں تو مسلمان کے ساتھ حسن ظن کا حکم دیا گیا ہے اور سلف اسی پر عامل رہے ہیں؛ لیکن فاضل مؤلف ائمہ حنفیہ اور اصولیین احناف (جو باوجودے کہ کبار علماء میں سے تھے) کے متعلق کسی طرح حسنِ ظن سے کام لینے کی زحمت نہیں فرماتے، یہی وجہ ہے کہ مشتبہ عبارات تو درکنار، صاف سیدھی باتوں میں بھی جہاں تک ہو سکے، وہ ٹیڑھا پن پیدا کر کے اعتراض قائم کرتے ہیں۔

اس کا کچھ اجمالی اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

مِن أقبح أنواع الظّاهريّة فی الحنفية هو التجمّد علی الظّواهر اللغوية المهجورة شرعًا. ظاهريةَ الحنفية أفسدتْ شيئًا كثيرًا مِن الحقائق الشّرعية. ظاهريّة ابن حزم أفضل كثيرا وأسلم مِن ظاهريّة أهل الرّأی[1].

ترجمہ: حنفیہ میں سے سب سے بدترین قسم کی ظاہریّت شرعاً ترک شدہ لغوی ظواہر پر جم کر رہنا ہے۔ حنفیہ کی ظاہریّت نے بہت سی شرعی حقیقتوں کو بگاڑ دیا ہے۔ ابن حزم کی ظاہریّت اہل الرائے کی ظاہریّت سے کہیں بہتر اور سلامتی والی ہے۔

''منار'' میں خاص کا حکم ذکر کرنے کے بعد اس پر کچھ تفریعات ذکر کی گئی ہیں، اس کو شروع کرتے ہوئے نورالانوار کے مؤلف علامہ ملاجیون رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

شروع فی تفريعات مختلف فيها بيننا وبين الشّافعی علی ما ذُكر مِن حكم الخاصّ.

ترجمہ: ''خاص کے حکم کے ضمن میں ہمارے اور امام شافعی کے درمیان مختلف تفریعات کا بیان''۔

اس پر حاشیہ لگا کر فاضل مؤلف (جناب ثناء اللہ زاہدی) لکھتے ہیں:

قلت: بلْ مختلف فيها بينكم وبين اللّٰه سبحانه وتعالى وبين رسول اللّٰه لأجل مخالفتكم لصريح النّصوص وصحيحها فى هذه المسألة(۲).

ترجمہ: ''میں کہتا ہوں کہ یہ اختلاف آپ کے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہے؛ کیونکہ آپ نے اس مسئلے میں صریح نصوص اور صحیح احادیث کی مخالفت کی ہے۔''

حضرت ملا جیون رحمہ اللہ کے بارے میں فاضل مؤلف لکھتے ہیں:

مِن عادة الشّارح عزو ما لمْ يقلْ به الشافعىّ إليه مِن الأقوال كذبًا وافتراءً ثمّ النّقد عليه ظلمًا وعدوانًا(۳).

ترجمہ: ''یہ شارح کی عادت ہے کہ وہ وہ اقوال جو امام شافعیؒ نے نہیں کہے، انھیں جھوٹ اور افتراء کے طور پر ان کی طرف منسوب کرتا ہے، پھر ان پر ظلم اور زیادتی کے ساتھ تنقید کرتا ہے۔''

یہ عبارتیں ایسی ہیں جن پر تبصرہ کرنے یا ان کے تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

ان اعتراضات ونقود کی اجمالی حیثیت

اس ناکارہ کو بھی اصول فقہ کی مختلف کتابیں پڑھاتے پڑھاتے ایک دہائی ہوگئی، اس دوران اس فن کی متعدد کتابیں پڑھانے کی توفیق نصیب ہوئی، اس فن کی متداول کتابوں (میں سے جہاں تک رسائی ہوسکی) کا مطالعہ کیا گیا، کئی سالوں سے شعبان کے مہینے میں اس فن کا مستقل دورہ بھی کرایا جاتا ہے جس میں فضلاء ومدرسین کرام بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس طویل مطالعاتی سفر میں کئی سالوں سے شیخ زاہدی صاحب کی یہ کتاب بھی پیش نظر رہی ہے اور دروس ومحاضرات میں موقع بموقع اس کتاب کے بعض ردود ونقود پر بھی بات ہوتی رہتی ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ پوری کتاب کا منصفانہ علمی جائزہ لیا جائے؛ لیکن بار بار مراجعت کے بعد محسوس یہ ہوا کہ اس میں وقت تو زیادہ صرف ہوگا؛ لیکن فائدہ زیادہ نہیں ہوگا؛ اس لیے اجمالی طور پر اصولی جائزہ تجزیہ کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اس کتاب کو بار بار دیکھنے اور اس میں ذکر کردہ ردود ونقود کا جائزہ لینے کے بعد واضح ہوجاتا ہے کہ فاضل مؤلف کو حنفیہ اور اصولِ احناف سے خدا واسطے کا بیر ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ بہت سی جگہ اشکال کرنے کا کوئی خاص تُک نہیں بنتا؛ لیکن بات میں بات ملا کر اشکال کھڑا کردیا جاتا ہے، بسا اوقات حضرت ملا جیون رحمہ اللہ کے کلام میں کوئی کمزوری محسوس ہوئی، مثال میں کوئی سقم معلوم ہوا یا عبارت میں عجمیت کی بو نظر آئی تو اس کی بھی پورے جارحانہ انداز میں تردید کی جاتی ہے اور یہ تاثر

دیا جاتا ہے کہ یہ بھی حنفیہ کے کھاتے کی چیزیں ہیں۔

بہرحال فاضل مؤلف نے جتنے ردودونقود کیے ہیں، ان کا اگر گہرا اصولی تجزیہ کیا جائے تو درج ذیل چار نکات میں ان کو سمیٹا جاسکتا ہے:

ردودونقود کی پہلی قسم

ا:-مختلف اصطلاحات کی تعریف پر اشکالات واعتراضات۔

''منار'' یا اس کی شرح ''نور الانوار'' دیگر کتابوں کی طرح فنی کتابیں ہیں، ان میں اصولی اصطلاحات کی تعریفات کی جاتی ہے، تعریف کے موقع پر اکثر فاضل مؤلف اشکالات کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر ''منار'' میں جہاں ''خاص'' کی تعریف لکھی ہے، وہاں مؤلف نے بیس کے لگ بھگ ''اعتراض نما نکات'' ذکر فرمائے ہیں، ان میں سے بعض ''نکات'' یہ ہیں:

الف:- خاص کی اصطلاح صرف ماوراء النہر اور سمرقند کے مشائخ کی اختراع ہے، عراق کے علماء احناف اس کے قائل نہیں ہیں۔

ب:-اس اصطلاح کی تعریف ومفہوم میں اضطراب ہے۔

ج:-نظم کی یہ قسم اور یہ اصطلاح (اپنے اندر کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ) بعض مخصوص مسائل میں حنفیت کے مذہبی مصالح کے لیے ہی گھڑی گئی ہے۔

د:- جمہور موالک، شوافع، حنابلہ اور ظاہریہ میں سے کوئی اس کا قائل نہیں۔

ر:- یہ اصطلاح غیر دقیق، غیر سلیم اور غیر علمی ہے۔

س:-اس میں بہت سی علمی غلطیاں اور فنی کمزوریاں ہیں، ان غلطیوں کا تعلق خاص کی تعریف، تقسیم، حکم اور اس پر ہونے والے تفریعات وغیرہ سے ہے۔

ص:- خاص (وغیرہ) کی تعریف میں ''وضع'' کی قید لگانا وہم وخیال ہی ہے؛ کیونکہ خود اس بات میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ لغات کا واضع کون ہے؟

یہ تو صرف خاص کی تعریف سے متعلق بیس (۲۰) کے قریب ''نکات'' ذکر فرمائے ہیں، اس کے بعد جہاں خاص کی تقسیم اور پھر اس کا حکم ذکر کیا جاتا ہے، وہاں تو ان کے علاوہ مزید چالیس سے زیادہ اس نوعیت کے اعتراض نما باتوں کو ''نکات'' کی شکل میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

اسی طرح دیگر اصطلاحات کی تفسیر وتعریف کے موقع پر بھی اسی انداز میں پورے بسط وتفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

ردودونقود کی دوسری قسم

تفریعات پر اعتراضات واشکالات۔علم اصول فقہ کے ساتھ اعتناء رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ متکلمین کرام کی بہ نسبت حضرات حنفیہ کے اصول فقہ کی ایک صفت یہ ہے کہ اس میں تفریعات زیادہ ہیں، ہر ہر قاعدہ کے تحت مثال یا متعدد مثالیں ذکر کی جاتی ہیں، یہ بات اس منہج کی خوبی گردانی گئی ہے۔ فاضل مؤلف کو ان میں سے اکثر تفریعات میں بھی اعتراضات واشکالات ہوتے ہیں اور وہ پوری جرأت وتفصیل کے ساتھ اس کو ذکر کرتے رہتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ''منار'' اور ''نورالانوار'' میں خاص کے حکم بیان کرنے کے بعد اس پر تفریع کے طور پر سات مسائل ذکر فرمائے گئے ہیں، فاضل مؤلف صاحب نے جلد اول کے ص ۱۰۸ سے لے کر ص ۱۴۶ تک تقریباً چالیس صفحات میں ان سات مسائل پر طرح طرح کے اعتراضات واشکالات کیے ہیں، ان اشکالات کے ضمن میں وہ تعریض وتنقید کے پیرائے میں یہاں تک لکھ گئے:

صريح الكتاب وصحيح السنّة هى المصادر الأصليّة للأحكام الشّرعية، مَن بنى فقهه عليها كان إسلاميّا خالصًا ومَن بناه على أصل آخر لا يُنسب فقهُه إلى الإسلام أبدًا.

ترجمہ: ''صریح کتاب اور صحیح سنّت شرعی احکام کے اصل ذرائع ہیں، جو شخص اپنے فقہ کو ان پر مبنی کرے وہ ایک خالص اسلامی فقیہ ہوگا اور جو شخص اسے کسی اور اصول پر بنائے، اس کا فقہ کبھی بھی اسلام سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔''

کچھ سطر بعد لکھتے ہیں:

إنّ مِن أخطر أبواب الزّيغ والزّلّة والضّلال بعد العلم والإيمان هو التّعامل مع الأحكام الشّرعية بعد تعرّيها وتجريدها مِن الكلمات الّتى شرع اللّٰه سبحانه وتعالى شريعتَه عن طريقها(۴).

ترجمہ: ''علم اور ایمان کے بعد گمراہی، خطا اور ضلالت کا سب سے خطرناک راستہ یہ ہے کہ انسان شرعی احکام کے ساتھ اس طرح معاملہ کرے کہ ان کو ان الفاظ سے الگ کردے جن کے ذریعے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی شریعت کو بیان کیا ہے۔''

چند صفحات کے بعد لکھتے ہیں:

قلت: وما هو الدّليل مِن الكتاب والسنّة على هذه الغاية؟ أم أنّها محض استحسان؟ أم أنّها تشريع بالظنّ والتّخمين والهوى؟(۵).

ترجمہ: ''اس غایہ پر کتاب وسنت سے کیا دلیل ہے؟ یا یہ صرف ذاتی پسند ہے؟ یا یہ قیاس، گمان اور خواہشات کی بنیاد پر شرعی احکامات کو گھڑنا ہے؟''

ردودونقود کی تیسری قسم

مخالف اصولیین کے دلائل کو معارضے کے طور پر پیش کرنا۔ اس کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں اور دونوں سے ہمارے فاضل مؤلف استفادہ کرکے تردید وتنقید کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ بعض مسائل میں اصولیین احناف کا دیگر اصولیین سے اختلاف ہوتا ہے، ایسے مسائل میں وہ احناف سے مخالفت رکھنے والے اصولیین کے دلائل کو لے کر معارضے اور مقابلے کے طور پر پیش کرتے ہیں، بعض جگہ ان کا نام لے لیتے ہیں؛ جب کہ بہت سی جگہ کلام سے اس قدر جذباتیت اور برہمی کا اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید کا اسلوب بھی اصولی نہیں رہ پاتا؛ بلکہ سطحیت کا شکار ہوجاتا ہے اور مخالف اصولیین کا حوالہ تک ذکر نہیں کیا جاتا؛ لیکن فن کی مہارت رکھنے والے اور کتبِ فن کی ورق گردانی کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اصل سرچشمہ کہاں ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ متعدد مسائل میں خود اصولیین احناف کی عبارات مختلف ہیں، بعض جگہ موقف میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، فقہائے واصولیین احناف کے دو بڑے طبقات تھے، ایک عراق کے علماء ومشائخ اور دوسرے سمرقند اور ماوراء النہر کے اہل علم وفضل، فقہ اور اصول فقہ کے متعدد مسائل میں ان دو طبقات کے درمیان باہمی اختلاف پایا جاتا ہے، ہمارے فاضل مؤلف کا مطالعہ چونکہ کافی وسیع ہے (گو دقیق نہیں ہے)؛ اس لیے اس نوعیت کے اختلاف بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ پاتے اور وہ ایسے اختلافات کو اجاگر کرنے کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے؛ بلکہ بہت سی جگہوں میں (خاص کر اصطلاحی کلمات کی تعریف کے موقع پر) تو تعبیر والفاظ کے اختلافات کا سہارا لے کر بھی یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اس میں احناف کا باہم شدید اختلاف ہے؛ اس لیے یہ اصل اور قاعدہ کی حیثیت کہاں اختیار کرسکتا ہے!

مثال کے طور پر خاص، عام، مشترک، مؤول، ظاہر، نص، مفسّر، محکم، خفی، مشکل، مجمل اور متشابہ وغیرہ میں سے کسی بھی اصطلاح کی تعریف یا حکم کی بحث کو دیکھ لیا جائے، ہر جگہ پر اصولیین احناف کے اندرونی اختلاف کو اجاگر کرکے اصول کو کمزور کرنے یا کمزور دکھانے کی مسلسل اور متواتر کوشش دکھائی دیتی ہے؛ بلکہ متعدد جگہوں پر صراحت سے لکھتے ہیں کہ علماء اصول کے اختلاف نے اس بحث/ضابطہ کی علمی قیمت ہی ختم کردی ہے۔

ردود ونقود کی چوتھی قسم

ردود ونقود کی چوتھی قسم عمومی نوعیت کے اشکالات ہیں۔اس سے مقصود یہ ہے کہ فاضل مؤلف نے اصول احناف کی تردید کرتے کرتے بعض ایسے مسائل کو بھی ہدف تنقید بنایا ہے جو حنفیہ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہیں اور صرف اصول احناف کی کتابوں ہی میں ذکر نہیں ہوتی؛ بلکہ بعض دیگر علماء اصول یا جمہور اصولیین بھی اس کے قائل ہیں۔

مثال کے طور پر اصول فقہ میں سنت کی بحث کے ضمن میں سنت کی تقسیم کی جاتی ہے کہ سنت دو قسم پر ہے: ایک متواتر اور دوسری قسم خبر واحد ہے، بعض؛ بلکہ اکثر کتابوں میں یہ تقسیم ثلاثی ذکر کی جاتی ہے یعنی خبر متواتر، مشہور اور واحد۔اسی کتاب کی دوسری جلد ص۵۱۹ سے لے کر ۵۳۱ تک دس اعتراضات واشکالات ذکر کیے ہیں، اس کے بعد پھر متن میں جب متن کی عبارت شروع ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ حاشیہ میں اس کے علاوہ چھوٹے بڑے مختلف اعتراضات ومناقشات ذکر کرتے رہتے ہیں۔ان اعتراضات واشکالات میں سے بعض یہ ہیں:

الف: یہ تقسیم فلسفی فکر کی پیداوار ہے، نہ مسلمانوں کی یہ اصطلاح ہے اور نہ انھوں نے اس کو اختراع کیا ہے۔

ب: متواتر اور خبر واحد کی یہ تقسیم پہلے پہل اہل بدعت نے نکالی ہے اور نکالنے کا مقصد یہ تھا کہ خبر واحد کہہ کر عقیدے سے متعلق احادیث کو مسترد کریں۔

ج: عجیب علمی فتنوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متواتر خود تو محل تشویش فکر ہے؛ لیکن یہ بدیہی علم کا فائدہ دیتا ہے![۶]

ان ردود کی علمی حیثیت اور اصولی تجزیہ

یہ اور ان جیسے تمام ردود ونقود کو سامنے رکھ کر اصولی تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان اعتراضات کی وجہ سے اصول پر کوئی معتد بہ زد نہیں پڑتی، جس کی وجوہات یہ ہیں:

پہلی قسم کے ردود کا تجزیہ

پہلی قسم کے ردود کا تعلق مختلف اصطلاحات کی تعریف اور تشریحی کلمات کے ساتھ ہے؛ حالانکہ تعریف وتوضیح کا یہ اختلاف بسا اوقات تو الفاظ وتعبیرات ہی کا اختلاف ہوتا ہے جس کا مفہوم ومصداق پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑتا؛ جب کہ بسا اوقات حقیقی اختلاف بھی ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے مفہوم ومصداق میں بھی اثر پیدا ہو جاتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود مآل کار کوئی ایسا نتیجہ برآمد

نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اصول ہی غلط ٹھہرے یا اس پر متفرع ہونے والے مسائل میں کوئی تبدیلی پیدا ہو۔

مثال کے طور پر فاضل مؤلف نے ''خاص'' کی تعریف، تقسیم اور اس کے حکم کو غلط ثابت کرنے پر کافی طویل بحث فرمائی ہے، ہم بغیر کسی مناقشہ کے مؤلف کی یہ تمام باتیں تسلیم بھی کرلیں تو اس سے کیا نقصان ہوگا؟ مثال کے طور پر لفظ انسان اور حیوان کو خاص النوع اور خاص الجنس کے بجائے عام تسلیم بھی کرلیں تو بھی ان الفاظ کے ساتھ جو حکم وارد ہوگا، وہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے قطعی ہوگا اور اس لفظ کے تحت آنے والے سارے افراد کو شامل ہوگا۔ خاص کے مبحث پر متفرع ہونیوالے مسائل دوسری طرح بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔

اسی طرح خفاء کے لحاظ سے نظم کی قسموں میں سے ایک ''خفی'' ہے، فاضل مؤلف بعض احناف سے نقل کرتے ہیں کہ وہ اس کے قائل نہیں ہیں، ہم بلا چون و چرا اس بات کو تسلیم کرلیتے ہیں تو اس سے حنفیت کا کونسا مسلم مسئلہ غلط ثابت ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کا عملی طور پر کوئی خاطر خواہ نتیجہ ہاتھ نہیں آتا، حنفی سے متعلق مبحث کو یوں بھی حل کیا جاسکتا ہے کہ نظم میں پوشیدگی یا تھوڑی سی ہوگی جو محض ''طلب'' کرنے سے ہی حل ہوسکے اور یا اس سے کچھ زیادہ ہوگی جو محض ''طلب'' کرنے سے حل نہ ہو؛ بلکہ اس میں مزید فکر و تامل کی بھی ضرورت ہوتی ہے، دونوں کو ''مشکل'' کہا جاتا ہے۔

دوسری قسم کے ردود کا تجزیہ

تفریعات وامثلہ میں مناقشات قائم کرنا بھی کوئی زیادہ مفید کام نہیں ہے، مشہور ہے کہ "لامناقشة فی المثال" یعنی مثال میں مناقشات قائم نہیں کیے جاتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ایسے مناقشے کو بالکل درست بھی باور کرلیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مثال یا تفریع غلط ہے؛ لیکن مثال کی غلطی یا تفریع کے نادرست ہونے سے اصل وضابطہ تو غلط ثابت نہیں ہوتا، اگر کوئی شخص یہ ضابطہ یاد کرے کہ ''کل فاعل مرفوع'' اور پھر اس پر تفریع کرتے ہوئے مثال میں ''ضربت زیدا'' میں لفظ ''زید'' پیش کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ مثال میں غلطی کا شکار ہورہا ہے؛ لیکن اس کی اس غلطی کی وجہ سے اصل قاعدہ غلط ثابت نہیں ہوتا اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ''کل فاعل مرفوع'' کا ضابطہ ہی غلط ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ مثال کی غلطی اصول وقواعد کی غلطی کو مستلزم نہیں۔

تیسری قسم کے ردود کا تجزیہ

تیسری قسم کے ردود کا حاصل یہ تھا کہ دیگر علماء اصول کے اختلاف ودلائل کا سہارا لے کر یہ تاثر

دیا جائے کہ اصول احناف فلاں فلاں ائمہ مجتہدین کے اصول وضوابط سے مختلف ہیں یا بعض اصول میں خود علماء احناف کا اختلاف ہے؛ اس لیے غلط/مرجوح/خودساختہ یا ناقابلِ اعتماد ہیں۔

اعتراض واشکال کی یہ قسم بہت ہی کمزور، غیرمؤثر اور غیرمنتج ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح چاروں ائمۂ مجتہدین کے فقہی مسائل وتحقیقات مختلف ہیں یوں ہی اصول فقہ بھی مختلف ہیں؛ بلکہ خود فقہی مسائل وتحقیقات انھیں اصول پر مبنی ہیں، اب جس طرح محض کسی فقہی مسئلہ کے مختلف فیہ ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کیا جاتا ہے اور نہ ہی اختلاف کرنے والے مذاہب کی تغلیط کی جاتی ہے، یوں ہی اصول فقہ کے مباحث ومسائل کا بھی یہی حال ہے کہ محض اختلاف واقع ہونے کی وجہ سے کسی اصل کو غلط نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

جب یہ بات تسلیم ہے کہ مسئلہ اجتہادی ہے اور اختلاف کرنے والے اجتہادی لیاقت کے حامل ہیں تو اس کے بعد ایسے مسئلہ میں محض اختلاف پیدا ہوجانے کی وجہ سے کسی ایک یا سب اختلاف کرنے والوں پر نقد کرنا یا ان کے موقف کو کلیۃً غلط قرار دینا کہاں درست ہوسکتا ہے!

جس طرح اصول حدیث کے متعدد مسائل میں حضرات محدثین کرام کا اختلاف ہوتا ہے، متکلمین کے نہج کی اصولی کتابوں میں دسیوں مسائل ایسے پائے جاتے ہیں جن میں خود اس کلامی نہج کے اصولیین کا اختلاف ہوتا ہے تو کیا محض ان جیسے اختلافات کی وجہ سے اصول حدیث اور اصول فقہ متکلمین بھی غلط ٹھہریں گے؟

چوتھی قسم کے ردود کا تجزیہ

چوتھی قسم کے ردود کا حاصل یہ تھا کہ اصول فقہ کے بعض ان نظریات ومباحث پر اعتراضات کیے جائیں جو حنفیہ ہی کے ساتھ خاص نہ ہوں؛ بلکہ دیگر اصولیین کے یہاں بھی وہ نظریات ومباحث پائے جاتے ہیں اور وہ بھی ان کا اعتبار کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے جتنے اشکالات زیرنظر کتاب میں مذکور ہیں، ان میں سطحیت اور سرسری پَن نمایاں نظر آتا ہے، یہ اعتراضات علمی دقّت اور فنّی گہرائی پر مبنی نہیں ہیں؛ اس لیے ان جیسے بے وزن اشکالات کی وجہ سے اصول کی تغلیط نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ خود ان اشکالات کا قبلہ درست کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر فرض کرکے کہیں ان جیسے اعتراضات واشکالات کو بغیر کسی ردّ وقدح کے اگر درست مان لیا جائے تو اس سے صرف اصول فقہ احناف ہی کے بعض مسائل متاثر نہیں ہوتے؛ بلکہ متعلقہ دیگر مذاہب کے مسلّمات بھی مشکوک ومشتبہ قرار پاتے ہیں۔

ایک ضروری قابلِ لحاظ نکتہ

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ اور لائقِ توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ اصول فقہ احناف (۷) دیگر مجتہدین کرام کے اصول کی بہ نسبت راجح ہیں یا مرجوح؟ اس بات سے قطع نظر کرکے اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ چاروں متبوع مذاہب کے فقہائے واصولیین کے ہاں حنفیہ کے یہ اصول غلط محض نہیں ہیں؛ بلکہ اجتہادی میدان میں داخل اور اسی کا حصہ ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اجتہادی یا تقلیدی طور پر ان اصول پر چلتا ہے تو وہ گناہ گار اور گمراہ بالکل نہیں ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین ہوجانے کے بعد اب قابلِ تنقیح امر یہ ہے کہ اصول حنفیہ پر اس نوعیت کے ردود ونقود کا حاصل ومقصود کیا ہے؟

اگر یہ مقصود ہو کہ یہ اصول بالکل غلط اور گمراہی ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ صرف احناف ہی کی تغلیط اور انھیں کی مخالفت نہیں؛ بلکہ دیگر مذاہب کی بھی تغلیط کے مترادف ہے؛ کیونکہ وہ بھی ان اصول کو گمراہی بالکل نہیں سمجھتے اور اگر اعتراضات کا مطلب یہ ہو کہ یہ اصول سو فیصد قطعی نہیں ہیں؛ بلکہ اس کے خلاف بھی موقف اپنایا جاسکتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہم حنفیہ نہ اس کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اس سے حنفیہ کے اصول پر کوئی زد پڑتی ہے، پھر پورا متاعِ زندگی صرف کرکے ایسے اعتراضات کو اوڑھنا بچھونا بنانا اور موقع بے موقع ان کو اچھالتے رہنے کا کیا حاصل!

اللہ تعالیٰ ملتِ مرحومہ پر خصوصی فضل وکرم فرمائیں، اس کو فہمِ سلیم اور صراطِ مستقیم پر چلائے رکھیں، قیادت وخلافت کی خلعتِ فاخرہ سے اس کو مالا مال فرمائیں!

* * *

حواشی

(۱) ثواقب الأنظار، ج1 ص375، 376.

(۲) ثواقب الأنظار، ج1 ص109.

(۳) ثواقب الأنظار، ج1 ص374.

(۴) ثواقب الأنظار، ج1 ص.

(۵) ثواقب الأنظار، ج1 ص9.

(۶) ثواقب الأنظار، جص تا.

(۷) یہاں احناف کی قید ایک خاص وجہ سے لگائی گئی ہے کہ فاضل مؤلف اور اس مزاج کے دیگر حضرات پاک وہند میں عام طور پر حنفیت ہی کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں، ورنہ تمام ائمہ مجتہدین کے اصول کا یہی حال ہے۔

* * *

ولادت نبوی ﷺ کے وقت روم کی مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی حیثیت

(۲/۲)

از: ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی

غلاموں کے ساتھ سلوک

روم کی معاشرتی اور سماجی تاریخ وتہذیب کا مطالعہ یہ انکشاف کرتا ہے کہ روم کے اندر غلاموں کے ساتھ نہایت ناروا اور غیر مہذب سلوک اختیار کیا جاتا تھا، انھیں سامانِ تفریح اور روم میں اگرچہ آزاد لوگوں کو کسی بھی وجہ سے غلام بنایا جاسکتا تھا؛ لیکن عموماً جنگوں کے نتیجے میں فاتح قوم مفتوح اقوام کے اسیرانِ جنگ کو مکمل غلامی کے شکنجے میں جکڑ لیا کرتے تھے۔ رومی معاشرت آزاد اور غلام کی تقسیم کا شکار تھی۔ جرائم اور سزاؤں میں بھی اس تفریق کا خاص لحاظ تھا۔ آزاد کے جرم کی سزا کم اور غلام کی زیادہ تھی، اسی طرح اشراف اور رعایا کا معاملہ تھا۔

رومیوں کے یہاں اولین ایام سے غلامی چلی آرہی تھی۔ غلام خواہ ملکی ہوں یا غیر ملکی، جنگ میں ہاتھ آئے ہوں یا خریدے گئے ہوں، محض مال واسباب سمجھے جاتے تھے۔ ان کے آقاؤں کو ان کی موت وزندگی کا مکمل اختیار حاصل تھا۔ بہر حال اس تدریجی اصلاح کی بدولت جس نے بارہ تختیوں (The Twelve Tables) کے فرسودہ قوانین کو ہیڈرین (Hadrian) کے جامع ضابطۂ قوانین میں تبدیل کیا تھا، غلاموں کی حالت قدرے بہتر ہوگئی تھی؛ لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود جو رومی شہنشاہوں کی انسان نوازی یا دانشمندی نے پرانے قوانین میں کیں، غلاموں کا وجودِ جسمانی کلیۃً مالک کی مرضی کے تحت ہوتا تھا۔ سلطنت کے ہر ذی اقتدار شخص کے یہاں ہزاروں غلام تھے جنہیں ذرا ذرا سی تقصیر پر اذیت پہنچائی جاتی تھی اور کوڑے لگائے جاتے تھے (muhammadencyclopedia) میں غلامی کی صورتحال بیان کرتے ہوئے مائیکل برگان

(Michael Burgan) اپنی کتاب Empire of Ancient Rome میں رقم طراز ہے:

Slavery was considered a normal part of life throughout the Mediterranean world. After a military victory, the winners took some of the losing soldiers home with them as slaves. More than 100,000 people might be forced into slavery after a single Roman victory. A person might also be ordered into slavery after committing a crime or failing to pay a debt. Pirates also raided ships and forced the passengers onboard into slavery. In some cases, poor parents sold their children into slavery. Slaves had no legal rights and could be sold whenever a slave owner chose.

(Michael Burgan (2009), Empire of Ancient Rome, Chelsea House Publishers,NewYork,USA,Pg.85-86.:بحوالہ muhammadencyclopedia)

ان غلاموں سے مختلف میدانوں میں کام لیا جاتا تھا۔ جس کی طرف اشارہ کیرول مولٹن (MoultonCarrol) نے اپنی کتاب میں کیا ہے:

Slaves worked in a wide range of fields. Many were forced to work in the mines. They were often chained to their work areas, and most of them died of malnutrition and overwork. Agricultural slaves were somewhat better off because they worked in the open air. Many slaves—men, women, and children—worked in households.

(Carrol Moulton (1998), Ancient Greece and Rome: An Encyclopedia for Students, Charles Scribner's Sons, New York, USA, Vol. 4, Pg. 50 بحوالہ muhammaaencyclopedia)

ان کے یہاں غلاموں کو سزا دینے کے بھی عجیب وغریب طریقے رائج تھے، مثلاً کسی غلام سے کوئی ادنیٰ سا جرم صادر ہوا تو انھوں نے ایک بڑا بھاری پتھر اس کی کمر پر لاد دیا اور اس پر ستم یہ کہ غلام سے کہا گیا کہ اسی حالت میں جا کر کھیتوں میں کاشت کاری کرو۔ کبھی ان کو بطور سزا الٹا لٹکا دیا جاتا اور بڑی بڑی وزنی چیزیں ان کے جسم سے باندھ دی جاتیں اور کبھی ان کو اس بے دردی سے مارا جاتا کہ بے چارے پٹتے پٹتے قیدِ ہستی سے ہی آزاد ہو جاتے۔

روم کا معاشی نظام

روم کی معاشی تباہی میں ایک بڑا عنصر وہاں امیر وغریب کے درمیان پیدا ہونے والی وہ خلیج تھی

جس نے متوسط طبقے کو بالکل ہی غائب کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے امیر اور غریب کے درمیان بہت زیادہ فرق پیدا ہو گیا تھا۔(The Decline and Fall of the Roman Epire) کی درج ذیل عبارت میں اس امر کی وضاحت موجود ہے:

Economically, the gap between rich and poor increased as the empire began its decline. The middle class seems to have disappeared, while the division between the upper and lower classes grew.

(muhammadencyclopedia.com)

روم کی معاشی حالت کی تباہی میں روم پر ہونے والے مسلسل حملے بھی ایک ایسی مضبوط اور ناقابلِ تردید وجہ تھی جس کے نتیجے میں روم کی زرعی پیداوار تباہ و برباد ہو کر رہ گئی اور دیہاتیوں کو مجبوراً زراعت کا پیشہ ترک کر کے شہروں میں بود و باش اختیار کرنی پڑی۔ جس سے ایک طرف زرعی پیداوار میں بے پناہ کمی واقع ہوئی تو دوسری جانب بڑھتی ہوئی آبادی نے شہری توازن کو درہم برہم کر کے رکھ دیا۔ مؤرخین روم کی معاشی بدحالی کے بارے میں لکھتے ہیں:

The loss of revenue for the western half of the empire could not support an army - an army that was necessary for defending the already vulnerable borders. Continual Warfare meant trade was disrupted; poor technology made for low food production, the city was overcrowded, unemployment was high, and lastly, there were always the epidemics

(muhammadencyclopedia.com)

ولادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت روم کی معاشی حالت پر مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' میں Alfred J، کی کتاب Butler Arabs Conquest of egypty and the last thirty years of the Roman dominion کے حوالے سے بہت متوازن تجزیہ کیا ہے اس کو یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی انتہا کو پہنچ گئی تھی، باوجود اس کے کہ عام رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی، ٹیکس اور محصول دوگنے چوگنے بڑھ گئے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے اور اپنے ملکی حکمرانوں پر بدیسی حکومتوں کو ترجیح دے دیتے تھے،

اجارہ داریاں (Monopolise) اور ضبطیاں مصیبت بالائے مصیبت تھیں، ان اسباب کی بنا پر بڑے پیمانے پر فسادات اور بغاوتیں رونما ہوئیں؛ چنانچہ 532 عیسوی کے فساد میں 30 ہزار افراد دارالسلطنت میں ہلاک ہوئے اور ہر چند کے وقت اور مصلحت کا تقاضا تھا کہ اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیا جاتا؛ لیکن لوگ اسراف اور فضول خرچی سے باز نہیں آتے تھے اور اخلاقی گراوٹ کی جو سب سے پست سطح ہوسکتی تھی اس حد تک پہنچ چکے تھے اور صرف ایک ہی لگن سب کے دل سے لگی تھی کہ جس طرح ممکن ہو زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنا چاہیے اور اس کو فیشن پرستی عیش پسندی اور اپنی من مانی خواہشات کے پورا کرنے میں خرچ کیا جائے، انسانیت وشرافت کی بنیادیں اپنی جگہ سے ہل چکی تھیں، تہذیب واخلاق کے ستون اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ ازدواجی زندگی پر تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے تھے؛ تاکہ آزادی سے انھیں کھیل کھیلنے کا موقع ملے‘‘۔(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، صفحہ 36)

عدل وانصاف کا نظام بھی پوری طرح چرمرایا ہوا تھا، اس بات کو مولانا علی میاں ندوی نے اپنی کتاب ’’انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر‘‘ میں بھی لکھا ہے:

جس طرح اشیاء کی خرید وفروخت ہوتی اور ان کے دام ٹھہرائے جاتے ہیں، اسی طرح انصاف بھی فروخت ہوتا، رشوت وخیانت کی ہمت افزائی خود قوم کی طرف سے ہوتی تھی۔(ایضاً، صفحہ 37)

Edward Gibban کی کتاب "The History of the Decline and fall of the Roman Empire" کے حوالے سے مزید لکھا ہے:

’’چھٹی صدی عیسوی میں سلطنت کا زوال اور اس کی پستی انتہا پر تھی، اس کی مثال اس بڑے تناور اور گھنے درخت کی تھی جس کے سائے میں دنیا کی قومیں کبھی پناہ لیتی تھیں اور اب اس کا صرف تنا رہ گیا ہو، جو روز بروز سوکھتا جارہا ہو‘‘۔(ایضاً، صفحہ 37)

Henry Smith William کی مرتب کردہ کتاب "Historian's History of the World" کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

’’بڑے بڑے شہر جن میں تیزی کے ساتھ بربادی آئی اور پھر وہ سنبھل نہ سکے اور نہ اس لائق ہو سکے کہ اپنی عظمت رفتہ کو پھر زندہ کرسکیں، وہ گواہ ہیں کہ بازنطینی حکومت اس زمانے میں انتہائی انحطاط وتنزل کے عالم میں تھی اور یہ تنزل ٹیکس اور محصول میں زیادتی، تجارت میں پستی، زراعت سے غفلت، شہروں کی آبادی میں روز افزوں کمی کا نتیجہ تھا‘‘۔(ایضاً، صفحہ 37)

روم کا تعلیمی نظام

بچے کو پیدا ہوتے ہی اجرت پر رکھی گئی کسی دائیہ کے حوالے کر دیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں اس کی پرورش ماں کی گود سے زیادہ کسی دائی کی گود میں ہوتی تھی جو پاس پڑوس کے تمام بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ وہ ان کی بنیادی ضروریات پر نظر رکھنے سے زیادہ تفریح کا خیال رکھتی تھیں۔ گراتچّی (Gracchi) کی والدہ کرنیلیا (Cornelia)، جیولیس سیزر (Julius Caesar) کی ماں اوریلیا (Aurelia) اور اگسٹس (Augustus) کی والدہ اٹیکا (Attica) کے بارے میں منقول ہے کہ وہ استانی کے منصب پر متعین رہیں اور انھوں نے خود کو طبقۂ اشرافیہ کے بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی وابستہ کر رکھا تھا۔ اس ادارے میں سخت گیری کے استعمال اور اصولوں پر سختی سے کاربند رہنے کا ایک بہترین خاکہ متعین تھا جس کی وجہ سے انسانی ذہن کی معصومیت اور دیانتداری کو ختم کیا جاتا تھا اور غلط رسم و رواج اور منفی مثالوں کے اثرات سے بچوں کو خراب کیا جاتا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بچے بڑے ہو کر عُجب کے مرض میں مبتلا ہوتے، اپنے علاوہ غیر قوم کے افراد کو حقیر سمجھتے اور ہمیشہ جنگجوؤں کی طرح لڑنے بھڑنے اور درندگی پر آمادہ رہتے تھے اور یہ کیفیت ان کی اشرافیہ اور پڑھے لکھے لوگوں میں عام تھی جس کے اثرات آج کے یورپ میں بھی بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

روم کے قدیم رواج کے مطابق نوجوان اپنے بڑوں کے رویوں کا مشاہدہ کر کے اور ان کی ہدایات سن کر معاشرتی طرز عمل سیکھا کرتے تھے۔ ہر شخص اپنے والدین کو رہنما اور استاد سمجھتا تھا۔ اگر کسی کے والدین نہ ہوتے تو وہ سینیٹرز میں سے سب سے بزرگ اور عمر رسیدہ شخص کو اپنا استاد بنا لیتا تھا۔ بچے درسگاہ کے علاوہ اکثر وقت اپنے والد کے ساتھ گزارتے تھے۔ اگر والد کسان ہوتا تو لڑکے کھیت میں اس کی مدد کرتے۔ اگر خاندان شہر میں رہتا تو بیٹوں سے توقع کی جاتی کہ وہ والد کے ساتھ احترام سے کھڑے رہیں اور مہمانوں کو خوش آمدید کہیں۔ ان سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ اجتماع گاہ میں اپنے عہد کے نامور مقرروں کے خیالات سنیں۔ شروع کے ادوار میں نوعمر لڑکے اپنے والد کے ساتھ سینیٹ (Senate) میں جا سکتے تھے؛ مگر بعد میں ان پر پابندی لگا دی گئی جس کی وجہ سینیٹ (Senate) کے اہم معاملات کا بچوں کے ذریعے عورتوں تک پہنچنا تھا۔ دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ بچے اپنے والدین کی غیر مناسب حرکتیں اور غیر اخلاقی طرز زندگی دیکھتے تو وہ بھی اسی طرح کی حرکات کرنے لگتے اور درسگاہوں میں سکھائے گئے آداب و اخلاق فراموش کرنے لگتے تھے جو ویسے بھی نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔

عہد جمہوریت میں بچوں کو جو سب سے پہلی چیز سکھائی جاتی، وہ بارہ الواح (Twelve Tables) کے قوانین تھے۔ بچوں کو تعلیم کے ابتدائی دور میں ہی جب وہ لکھنا پڑھنا اور ریاضی سیکھ رہے ہوتے، بارہ الواح (Twelve Tabels) پر کندہ قوانین سکھائے جاتے تھے؛ تاہم بعد کے ادوار میں ان کی اہمیت کم ہو گئی تھی۔ عہد جمہوریت کے آخری دور کے مشہور رومی فلسفی اور سیاستدان سیسیرو (Cicero) کے مطابق اس کے لڑکپن کے دور میں تمام لڑکے بارہ الواح (Twelve Tables) کے متن کو بھجن کی طرح زبانی یاد کرتے تھے۔ جمہوری عہد کے دوسرے نصف اور عہد سلطنت میں لڑکے درس گاہوں میں پڑھنے جاتے تھے۔ روم میں تین اقسام کی درس گاہیں قائم تھیں جن میں بنیادی تعلیم کے ادارے، گرامر اور زبان کے دیگر قواعد سکھانے والی درس گاہیں اور علم الانشاء، بیان اور خطابت سکھانے والے مدارس شامل تھے۔ اس طرح کی درس گاہیں صرف روم شہر میں ہی نہیں؛ بلکہ تمام اہم صوبائی شہروں میں بھی موجود تھیں۔ سلطنت روم کے تمام حصوں میں معیار تعلیم مختلف تھا جس کی بنیاد جگہ اور طبقے کے مالی حالات تھے۔

طبقہ، اشرافیہ سے تعلق رکھنے والا بچہ جب درسگاہ جانے کی عمر کو پہنچتا تو اس کے ساتھ ایک معلم کو تعینات کر دیا جاتا جو عموماً ایک تعلیم یافتہ غلام ہوا کرتا تھا۔ وہ بچے کو صبح درسگاہ لے جاتا، وہاں اس کے اسباق ختم ہونے تک انتظار کرتا اور بعض اوقات اس کی کتابیں بھی خود اٹھاتا تھا۔ معلم بچے کی دیکھ بھال کرتا، اس کے اسباق میں مدد کرتا اور ضرورت پڑنے پر سختی کرتا تھا۔ الغرض، وہ بچے کا ہمدم اور دوست بن جاتا تھا اور اس کی معصومیت کو ختم کر کے اس میں اپنی چالاکی اور چال بازی کے ہنر کو منتقل کرتا۔

روم میں تدریسی عمل تین مراحل پر مشتمل تھا۔ پہلے مرحلے میں پڑھنا لکھنا اور ریاضی سکھائی جاتی تھی جسے لٹریٹر (litterator) یا لیوڈی میجسٹر (Ludi magister) کہلانے والا معلم سکھاتا تھا۔ اس کے بعد بچہ یونانی و لاطینی شاعری اور اس کے ساتھ نثر کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ان علوم کے خاص مدرسین گرامیٹکس (Grammaticus) کہلاتے تھے جو املا، ہجے اور اندازِ بیان پر خاص توجہ دیتے تھے۔ آخر میں لڑکوں کو ''علم البلاغت'' کے ماہرین رہیٹوریشین (Rhetorician) ''فنِ خطابت'' کی تربیت بھی دیتے تھے؛ مگر ایک قدر جو ان تمام درجات کے معلّمین میں مشترک تھی وہ یہ کہ وہ رومی معصوم بچوں کو بھی چالاک، عیار، خودسر اور تکبر میں مبتلا کر کے ان کے ذہنوں میں احساس برتری کو اجاگر کر دیتے تھے جس کے نتیجے میں رومی بچوں میں معصومیت تو مکمل طور پر ختم ہو جاتی؛ البتہ اس کی جگہ غرور، انانیت اور خودسری پیدا ہو جایا کرتی تھی۔

قدیم روم میں لڑکیاں ان چیزوں کو سیکھتی تھیں جن سے گھر بہتر انداز میں چلایا جا سکتا تھا؛ تاہم عورت کا گھر پر رہنے، چرخہ کاتنے اور کپڑا بننے کا روایتی تصور رومی سلطنت کی وسعت کے ساتھ ساتھ ختم ہوگیا تھا۔ امراء کی بیویوں کے پاس گھر کے کاموں کے لیے غلاموں اور باندیوں کی فوج موجود ہوتی تھی، نیز دکانوں پر کپڑے، بچھونے اور سامانِ آرائش کی بہتات تھی۔ عہد قدیم کی فنی مہارتوں کی اب ضرورت نہ رہی تھی؛ اس لیے لڑکیاں نجی اتالیق سے لکھنا پڑھنا سیکھنے کے لیے وقت نکال لیتی تھیں بعض اوقات نوجوان لڑکیاں اتالیق سے پڑھنے کے بہانے عشق بازی بھی کیا کرتی تھیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کے لیے خاص اساتذہ رکھے جاتے تھے جو انھیں گھر پر تعلیم دیتے تھے۔ سیسیرو (Cicero) نے اپنے ایک دوست ایٹیکس (Atticus) کا تذکرہ کیا ہے جس نے اپنی بیٹی کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے اساتذہ کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس طرح کی کثیر امثلہ رومی تاریخ میں محفوظ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکیوں کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے الگ الگ اساتذہ موجود تھے؛ تاہم ''علم البیان اور خطابت'' کی اعلیٰ تعلیم صرف لڑکوں کے لیے مخصوص تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لڑکیوں کو اس کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کی جلد شادی کروادی جاتی جس سے تعلیم کا سلسلہ رک جاتا تھا۔ شادی کی کم سے کم عمر 12 سال تھی اور اشرافیہ کے طبقے میں 12 سے لے کر 18 سال کی عمر تک شادی کرادی جاتی تھی۔ اس کے باوجود اکثر لڑکیاں ثانوی درجہ کی تعلیم مکمل کرتی تھیں۔ کچھ لڑکیاں شادی کے بعد بھی نجی استاد سے تعلیم جاری رکھتی تھیں؛ تاکہ وہ موقع ملتے ہی ان سے اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کرسکیں۔

روم کا نظامِ تعلیم عہد بہ عہد ترقی کرتا رہا؛ مگر وہ مقاصد حاصل نہیں کرسکا جو ایک اچھے نظامِ تعلیم کا نصب العین ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے تعلیم کو بنیادی ضرورت کی بجائے اشرافیہ کے طبقے تک محدود ایک آسائش بنادیا تھا۔ تعلیم عوام کی پہنچ سے دور رکھی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ عملی زندگی کے میدان میں بھی پیچھے تھے۔ امراء تعلیم کی بدولت اچھے عہدے اور منصب حاصل کرلیتے تھے۔ وہ قانون، سیاست اور دیگر شعبوں میں ترقی بھی کرتے تھے؛ جب کہ غریب ہمیشہ اپنی بقا کی فکر میں ہی رہتے تھے۔ یوں معاشرہ دو درجوں میں منقسم ہوگیا تھا۔ امیر، امیر سے امیر تر اور غریب غریب سے غریب تر ہوگیا تھا۔ امراء غریب طبقے کو اپنا اطاعت گزار اور خادم سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود کو آزاد خیال سمجھنے والے اس معاشرے میں عورتوں کو بھی تعلیم تک آزادانہ رسائی نہ تھی۔

جہاں جہاں رومی نظام تعلیم کے نمونے کو اپنایا گیا وہاں اس کے تباہ کن اثرات ظاہر ہوئے

ہیں۔ آج بھی کچھ معاشروں میں لالچ، دولت وعہدے کی ہوس، اخلاقی تنزل، غربت وافلاس، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، خاندانی نظام کی تباہی سمیت کتنی ہی تباہ کاریاں ہیں جو رومی نظام تعلیم کے ماڈل کو آنکھ بند کر کے اپنانے کے سبب رونما ہوئی ہیں جن سے بچنا ہر مسلم معاشرے کی بقا کے لیے نہایت ہی اہم ہے۔ (دیکھیے تفصیل: muhammad encyclopedia.com)

رومی تہذیب وتمدن

چھٹی صدی عیسوی میں رومی تہذیب وتمدن بھی پوری طرح سے ہچکولے لے رہا تھا۔ کوئی معاشرہ جن تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی بنیاد پر مہذب ہوسکتا ہے وہ تمام قدریں رومی معاشرے میں مفقود ومعدوم ہوچکی تھیں۔ اخلاق اور سیرت وکردار جیسی پاکیزہ صفات بری طرح متاثر ہوچکی تھیں۔ ہما ہمی اور اخلاقی خرابیوں کا دور دورہ تھا، بدامنی، بدعنوانی عام تھی اور فکری ونظریاتی طور پر سماج میں تنگ نظری پائی جانے لگی تھی۔ اجتماعی تعلق کا احساس بھی زد میں آچکا تھا۔ علم وادب اور تحقیق وتفتیش کے تمام راستے مادیت کے آلۂ کار ہو چلے تھے۔ گویا روم تہذیبی وثقافتی طور پر پوری طرح سے بد تہذیبی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

رومی تہذیب کی بابت مولانا علی میاں ندوی نے ''تاریخ اخلاق یورپ'' کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ روم کی تہذیبی حیثیت کا آئینہ دار ہے:

رومی قوم کے اخلاق، سیاست اور معاشرت میں مذہب کا کوئی اثر اور ان کے احساس اور میلانات میں اس کا کوئی اقتدار ونگرانی باقی نہیں رہی تھی، مذہب میں کوئی گہرائی اور قوت باقی نہیں رہی تھی کہ وہ دل کی گہرائی سے ابھرتا اور روح پر حکومت کرتا، وہ محض ایک رسم ورواج بن کر رہ گیا تھا، سیاست ومصلحت کا تقاضا تھا کہ خواہ وہ برائے نام ہی رہے؛ لیکن کسی نہ کسی شکل میں باقی رہے۔

رومی مذہب کی اصل بنا خودغرضی پر تھی، اس کا مطمع نظر اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ افراد مرفہ الحال رہیں اور صعوبات اور مصائب سے محفوظ رہیں؛ چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ روم میں گوصدہا جاں باز پیدا ہوئے؛ لیکن نفس کُش زاہد ایک بھی نہ اٹھا، یہاں ایثار کی جو بہتر سے بہتر مثالیں ملتی ہیں وہ بھی مذہب کے اثر سے آزاد اور وطن پرستی پر مبنی تھیں۔

رومیوں کا ایک بڑا امتیاز وخصوصیت ان کی شہنشاہیت پسندی اور استعماری روح اور زندگی کا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ ہے، یہی وہ ترکہ ہے جو موجودہ یورپ کو اپنے رومی مورثوں سے ملا ہے، جرمن نومسلم عالم محمد اسد صاحب نے اپنی کتاب (Islam at the Cross Road) میں اس کا

بڑی خوبی سے تذکرہ کیا ہے وہ کہتے ہیں:

''رومی شہنشاہی پر جو خاص خیال حاوی تھا وہ محض ملک گیری کا خیال اور مادر وطن کے لیے دوسری قوموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لوٹ کھسوٹ کرنا تھا، رومی رؤسا وامرار اور اونچے طبقے کے لوگ اپنے لیے فارغ البالی اور امارت کی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لیے کسی ظلم و بے دردی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ باقی وہ رومی انصاف جس کا بڑا شہرہ ہے، وہ محض رومیوں کے لیے تھا، مخصوص سیرت اور کریکٹر زندگی اور تمدن کے محض مادی تصور ہی پر قائم ہوسکتا تھا، اگرچہ ان کی مادیت میں کچھ آراستگی اور لطافت ذوق پیدا ہوگئی تھی؛ لیکن تمام روحانی قدروں سے وہ بالکل بیگانہ تھی اور رومیوں نے کبھی بھی سنجیدگی اور واقعیت کے ساتھ دینداری اختیار نہیں کی تھی، ان کے تقلیدی دیوتا محض یونانی حکایات وخرافات کی پھیکی نقل تھے، انھوں نے محض اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور قومی وحدت کے خیال سے ان ارواح کو تسلیم کرلیا تھا، وہ ان دیوتاؤں کو اپنی عملی زندگی میں دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے، ان کا کام صرف اتنا تھا کہ جب ان سے فرمائش کی جائے تو اپنے مجاوروں کی زبانی پیشین گوئیاں کردیں؛ لیکن ان کو انھوں نے یہ حق کبھی نہیں دیا تھا کہ وہ لوگوں پر اخلاقی قوانین نافذ کریں۔''

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، صفحہ 206)

مولانا علی میاں ندوی مزید رقم کرتے ہیں:

''جمہوری دور کے آخر میں روم میں اخلاقی انحطاط اور حیوانی ہوس رانی اور تعیش کا ایسا سیلاب آیا کہ رومی اس میں بالکل ڈوب گئے اور وہ اخلاقی نظام وضوابط جو رومی قوم کی ابتدائی خصوصیت تھی خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے، یہ اجتماع اور معاشرت کی عمارت میں ایسا تزلزل آیا کہ قریب تھا کہ وہ زمین پر آرہے۔ مولانا علی میاں ندوی جان ولیم ڈریپر کی معروف کتاب ''معرکۂ مذہب وسائنس'' کے حوالے سے مزید تحریر کرتے ہیں:

''جب جنگی قوت اور سیاسی اثر کے لحاظ سے سلطنت روما منتہائے ترقی پر فائز ہوگئی تو مذہبی اور عمرانی پہلو سے اس کی اخلاقی حالت فساد کے درجۂ اخیر کو پہنچ چکی تھی، اہلِ روما کی عیش پرستی وعزت پسندی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی، ان کا اصول یہ تھا کہ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو ایک سلسلۃ العیش بنادے، پاک بازی، حظِ نفس کے خوانِ نعمت پر بمنزلۂ نمکدان ہے اور اعتدال سلسلۂ حظ نفس کی درازی کا محض ایک ذریعہ ہے، ان کا دسترخوان سونے چاندی کے باسنوں سے جن پر جواہرات کی پچہ کاری ہوتی تھی جھلکتے ہوئے نظر آتے تھے، ان کے ملازم زرق برق پوشاکیں پہنے ان کی خدمت

کے لیے کمر بستہ کھڑے رہتے تھے ہرویان روما جو عام طور پر عصمت کی طلائی زنجیر کی قید سے آزاد تھیں، ان کی مستی انگیز صحبتوں کا لطف دوبالا کرنے کے لیے محو ناز رہتی تھیں، عالی شان حماموں، دل کشا تماشہ گاہوں اور جوش آفریں دنگلوں سے جن میں پہلوان کبھی ایک دوسرے سے اور کبھی وحشی درندوں سے اس وقت تک مصروف زور آزمائی رہتے تھے؛ جب تک کہ حریفوں میں سے ایک ہمیشہ کے لیے خاک وخون میں سو نہ جائے، اہلِ روما کے سامانِ تعیش پر مزید اضافہ ہوتا تھا، دنیا کے ان فاتحوں کو تجربہ کے بعد یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ عبادت اور پرستش کے لائق اگر کوئی شے ہے تو وہ قوت ہے؛ اس لیے کہ اسی قوت کی بدولت اُن تمام سرمائے کا حاصل کرنا ممکن ہے جو محنت اور تجارت کی مسلسل جانکاہیوں اور عرق ریزیوں سے پیدا ہوا ہے، مال اور املاک کی ضبطی، صوبہ جات کے محاصل کی تشخیص زور بازو کی بدولت جنگ میں کامیاب ہونے کا نتیجہ ہے اور فرمانروائے دولت روما اس زور وقوت کا نشان یا علامت ہے، غرض روما کے نظام تمدن میں جاہ وجلال کی ایک جھلک تو نظر آتی تھی؛ لیکن یہ جھلک اس نمائشی ملمع کی چمک کے مشابہ تھی جو یونان عہد قدیم کی تہذیب پر چڑھ گیا تھا۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، صفحہ 207-208)

متذکرہ بالا دونوں اقتباسات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ روم اخلاقی اور تہذیبی طور پر بھی بہت ہی پستی اور تنزل کا شکار تھا۔

روم کی مذہبی حیثیت

روم کی تاریخ وتہذیب کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں اہلِ روم مذہب ودھرم کے تئیں بہت زیادہ راسخ العقیدہ اور دینی رسوم وروایات کے پابند نہیں تھے۔ خورشید احمد اپنی کتاب ''تاریخِ مذاہب'' میں رقم طراز ہیں:

''چھٹی صدی قبل مسیح میں روم میں ایک خودمختار حکومت کے وجود کا پتہ چلتا ہے اس سے قبل غالباً سرداروں کی حکومت رہی ہوگی، اس حکومت میں بادشاہ کو غیر معمولی اقتدار حاصل تھا، بادشاہ ملکی اور سیاسی سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا مذہبی پیشوا بھی تھا''۔ (تاریخ مذاہب، صفحہ 185)

مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی اپنے مذہب وعقائد میں راسخ الایمان نہ تھے اور درحقیقت وہ اس بارے میں معذور بھی ہیں؛ اس لیے کہ جو مشرکانہ اور وہم پرستانہ مذہب روم میں رائج تھا اس کا مختصر یہ تھا کہ رومی علم میں جس قدر ترقی کرتے جائیں اور ان کے دماغ روشن ہوجائیں اتنی

ہی اس مذہب کی بے توقیری اور اس کی عظمت میں کمی واقع ہو جائے اور یہ تو گویا انھوں نے پہلے ہی دن سے طے کر لیا تھا کہ دیوتاؤں کو سیاست اور امور دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ تھیٹر میں جب اس مضمون کے اشعار پڑھے جاتے تھے کہ دیوتاؤں کو دنیاوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں تو لوگ انھیں نہایت ذوق وشوق سے سنتے۔

یہ رومن بت پرست مندروں میں تو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور تھیٹروں میں ان کے ساتھ تمسخر کرتے تھے، رومی مذہب کی گرفت اپنے پیروؤں پر اتنی ڈھیلی ہوگئی تھی اور جذبہ مذہبی اتنا سرد پڑ چکا تھا کہ لوگ بعض اوقات دیوتاؤں کے ساتھ بے ادبی اور اشتعال میں آ کر گستاخی کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے؛ حتی کہ مذہب کا اخلاقی اثر تقریباً بالکل فنا ہو گیا تھا، جذبۂ تقدس تقریباً مٹ گیا اور اس کے مظاہر ہر شخص کو نظر آنے لگے''۔ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، صفحہ: 205-204)

روم کی سیاسی حیثیت

روم کی سیاسی تاریخ کافی طویل اور شکست وریخت سے ہمکنار ہے۔ روم ملوکیت، جمہوریت اور شہنشاہیت تینوں طریقۂ حکومت سے گزرا ہے۔ رومی شہنشاہیت کا آغاز جولیس سیزر (Julius Caesar) سے ہوتا ہے جس نے اپنے دور اقتدار میں پورے طور پر استبداد اور مطلق العنانی کا مظاہرہ کیا۔ اور اسی وقت سے اس عقیدے کی بھی ابتداء ہوئی کہ ''قیصر صفاتِ الوہیت کا مالک ہے''؛ لیکن وہ شخص جس نے رومی شہنشاہی کو استوار کیا اور جس نے بعد کی تمام سیاسی نشوونما پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ اغسطس (Augustus) تھا۔ اس نے بادشاہت کو موروثی کرنے کی تدابیر کی اس کی قوت کا راز دولت، فوج پر قبضہ اور عنان حکومت پر مضبوط گرفت میں پوشیدہ تھا، اس کی وفات کے بعد ٹائیرس برسر اقتدار آیا، اس کی تخت نشینی کے وقت مطلق العنانیت کا دعوی پھر کیا گیا کہ اور اس نے سلطنت و حکومت کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا کہ ''نا قابلِ تقسیم شئی کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے۔ سلطنت ایک جسم واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کر سکتا ہے''، اس کے بعد سلطنت پر جنگی عنصر کا غلبہ بہت زیادہ بڑھ گیا؛ چنانچہ کلاڈیس (Claudius) اور نیرو (Nero) دونوں کی تخت نشینی روما کے مقامی عساکر کی تائید کا نتیجہ تھی پھر 69ء کے واقعات سے یہ بات اور بھی ظاہر ہوگئی کہ بادشاہ کا بنانا اور بگاڑنا فوج کا کام ہے۔

متذکرہ حکمرانوں کے بعد اور مارکس آریلیئس (Marcus Aurelius) کی موت کے بعد

180ء سے رومیوں کے زوال وپستی کی ابتدا ہوئی۔ رومی سلطنت برابر انتشار سے دوچار ہوتی رہی اور پیہم خارجی حملوں کو سہتی رہی؛ یہاں تک کہ جب 306 میں قسطنطین اعظم قیصر ہوا تو گویا سلطنت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا، اس نے رومی سلطنت کی ازسرنو تنظیم کی اور اسے متحد کیا، اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ سیاسی وجنگی مصالح کی بنا پر پایۂ تخت کو روم سے قسطنطنیہ منتقل کیا۔ یونانی زبان کو دفتری زبان قرار دیا، اس سے ایک طرف تو بازنطینی سلطنت کی بنیاد پڑی اور دوسری طرف روم میں ایک سیاسی خلا پیدا ہوگیا، جسے بعد میں پاپائے روم نے پر کیا۔ اس نے دوسرا اہم ترین قدم یہ اٹھایا کہ عیسائیت کو خود بھی اپنایا اور قانونی طور پر اس کو سلطنت کا مذہب بھی قرار دیا تاریخ سلطنت روما میں ایک ایسا موڑ ہے جس کی بنا پر نہ صرف سلطنت کا ارتقا متاثر ہوا؛ بلکہ عیسائیت نے ازمنۂ وسطی کے سیاسی افکار کو بھی اس درجہ مغلوب کیا کہ ان کو عیسائی اعتقادات سے جدا کر کے سمجھنا ناممکن ہے، اور ایک افکار سیاسی پر ہی کیا موقوف پوری مغربی تہذیب پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ (نقوش کا رسول نمبر، جلد پنجم، صفحہ 18-17)

تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ قسطنطین اعظم کے یہ سارے اقدامات بھی سلطنتِ روما کے انتشار وزوال کو نہ روک سکے۔ سلطنت کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی، مشرقی اور مغربی حصے اور ان کے تاجدار الگ الگ ہوگئے اور قسطنطین کی موت 337 کے بعد ہی سیاسی خانہ جنگیوں کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سلطنت کی تقسیم کا آغاز باقاعدہ طور پر اگرچہ ولنٹینین (Valentinian) کے زمانہ 364 سے ہی ہو چکا تھا؛ لیکن قطعی تقسیم سلطنت 395 میں اس طرح ہوگئی کہ مشرقی حصوں کا ارکیڈیس (Arcedius) اور مغربی حصوں کا ہونوریس (Honorius) حکمراں بن گیا، اعیانِ سلطنت میں گروہ بندیاں قائم ہوگئیں۔ باہمی نفاق اور فتنہ وفساد کا بازار گرم ہوگیا اور دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر وحشی اقوام نے حملے شروع کر دیے؛ چنانچہ روم قسطنطین کے بعد پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ 410 میں وزی گاتھ نے روم کو بڑی حد تک تاخت وتاراج کر دیا۔ روما کی تباہی وبربادی کے متعلق تجزیہ نگاروں نے لکھا ہے:

''یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ عیسائیت کا زوال اس کے عروج کے فوراً بعد شروع ہوگیا جس کا نظارہ عیسائی اور غیر قوموں نے بھی کیا کہ عیسائیت کی تحریک ''تباہ کن'' ثابت ہوئی اور اس نے رومی سلطنت کو کمزور کر دیا۔ رومیوں کے اعلیٰ طبقے کو دیکھتے ہوئے یہ نظر آتا ہے کہ عیسائیوں میں دنیاوی اور مادی خواہشات، نفسانی اغراض، عیش وعشرت کی ہوس، سرد مہری، عوامی معاملات کی طرف سے

بے توجہی، قومی معبودوں اور خداؤں کے لیے ذلت وحقارت ایسی خصوصیات ہیں جنہوں نے مستقلاً رومی طاقت کو رفتہ رفتہ روبہ زوال کر دیا۔ پھر عیسائیوں کا یہ اصرار کہ وہ وفاداری میں اوّلیت روم کو دیں گے مزید بدنامی کا باعث ہوا۔''

اس تباہی و بربادی کے ٹھیک 45 سال بعد 455 میں ونڈال نے پھر روما کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس طرح سلطنت رومہ کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں اس کا مغربی حصہ جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور تقریباً 560 میں سلطنت کے مغربی حصے پر وحشی اقوام کا مکمل قبضہ ہوگیا جسے جسٹینین (Justinian) جیسا بہادر فرماں روا بھی دوبارہ حاصل نہ کر سکا؛ حالانکہ اس کی بہادری یورپ میں ضرب المثل تھی۔

مغربی حصہ نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں پر مشتمل سلطنت کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی۔ سلطنت کی عدم مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خود رعایا حکمرانی سے اس حد تک نفرت کرتی تھی کہ وحشی اقوام کو رومیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ امراء وزراء اور سلاطین میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ عوام کو بغاوت سے روک سکیں۔ ان اندرونی بدنظمیوں سے ملک کا جو حال ہوگیا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر روم کے تمام بیرونی مخالفین ختم بھی ہو جاتے تب بھی سلطنت زوال وانحطاط سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی تھی۔ مزید برآں ان کے پاس ایسی کوئی اخلاقی قوت اور ذہنی وسائل بھی نہیں تھے جو ان حالات میں ان کا سہارا بن سکتے۔ (ایضاً، صفحہ 18-19)

سلطنتِ رومہ کا نظام

سلطنتِ رومہ کا نظام اور نظریہ جن اصولوں اور قاعدوں مبنی تھا ذیل میں ان کو بھی پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱- سلطنت روما کا اصل الاصول ''بادشاہت'' تھا۔ بادشاہ کے اختیارات غیر محدود تھے اور وہ تمام سیاسی اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ تھا، سلطنت کا تمام طرز عمل شاہی مرضی کے تابع اور تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے ہی تھا؛ اسی لیے جو ادارے مثلاً امراء کی مجلس یا مجلس جمہور وغیرہ بظاہر جمہوری نظر آتے ہیں وہ بالکل مصنوعی تھے۔ بادشاہت صرف ایک مخصوص گروہ، جماعت اور وطن کے اندر محصور تھی۔ حکمرانوں کی یہی وہ مخصوص جماعت تھی جس کی خاطر داری سلطنت کا مقصود تھی۔ اسی لیے رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے کہ ''جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں رومی سلطنت..

انسانوں سے (ظلم وزیادتی کے ذریعہ) ناجائز فائدہ اٹھا کر انسانوں کی مخصوص جماعت (حکمرانوں) کی راحت رسانی اور عیش وارام کا سامان فراہم کرتی تھی''۔

۲-سلطنتِ رومہ کا تخیل اگرچہ ''بہبود عامہ'' کے اصول پر مبنی تھا؛ لیکن یہ اصول خیال سے نکل کر عمل میں بہت کم آتا تھا۔ اس کے تخیل میں یونانی اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں؛ چنانچہ سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیشِ نظر رکھا؛ لیکن اس کے باوجود رومی تصور میں چند امتیازات بھی موجود ہیں، مثلاً رومیوں نے سلطنت کی قانونی حیثیت زیادہ واضح کی۔ قانون کو اخلاص سے ممیّز کیا۔ رومیوں کا خاندان، یونانیوں کی بہ نسبت سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔ نیز رومی سلطنت شہری اور مقامی نہیں؛ بلکہ قومی سلطنت تھی اور اس کا نصب العین ایک عالمگیر سلطنت کا تھا۔ اس کی نوعیت کے بارے میں سسرو کا خیال تھا کہ سلطنت روما ایک ایسی سلطنت ہے جو نام نہاد سلطنت کا نمونہ ہے، یعنی وہ بادشاہی، اعیانیت اور جمہوریت سب شکلوں کا مجموعہ اور سب سے بہتر ہے؛ لیکن ٹاسی ٹس نے کی کیا خوب کہا ہے کہ ''اول تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اگر جائے تو برقرار رہنا ناممکن ہے''۔

۳-رومی شہنشاہ کو کلیسا (Church) کی حمایت حاصل تھی؛ چنانچہ یہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ ''رومی شہنشاہیت عطیۂ خداوندی ہے''؛ تاکہ اس کی حکومت تمام دنیا پر تا ابد قائم رہے۔ پھر جب مسیحیت رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پائی تو اس کا استعمال بالکل سیاسی زور آزمائی کے لیے ہونے لگا۔ اگر ایک طرف بادشاہ نے مذہب کے معاملہ میں بھی سند قطعی حاصل کرلی اور سب کچھ اسی کے حکم کا محتاج ہوگیا تو دوسری طرف پاپائیت کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے اصل طاقت حاصل کرلی۔ پھر کلیسا اور ریاست کے درمیان کشمکش اور چپلش کا اغاز ہوا جو پورے ازمنہ وسطی کی بڑی نمایاں اور اہم خصوصیت ہے، اس کشمکش کی داستان بہت طویل ہے، اس کے چند نمونے یہاں ملاحظہ کیجیے!

پوپ (رومن کیتھولک کلیسیا کا سب سے بڑا پادری جسے یسوع مسیح کے رسولِ مقدس پطرس کا سلسلہ وار جانشین سمجھا جاتا ہے) کی پیشوائی مذہبی کے وقت 590 تا 604 سے معقول حد تک پاپائیت کے تغیر کا اظہار ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں سیاسی معاملات قطعی طور پر پاپاؤں کی توجہ کے محتاج ہوگئے۔ اولاً یہ صورت صرف روم کے لیے ہوئی اور بعد ازاں کل اطالیہ (دارالحکومت روم) کے لیے کچھ زمانے تک قسطنطنیہ کا اقتدار اعلی اور اس کے نائب مملکت کا اختیار زور وقوت کے ساتھ تسلیم کیا جاتا رہا۔ ساتویں صدی میں، مشرق میں مسلمانوں کے فاتحانہ حملوں کا بھی شمول ہوگیا تو شہر روم کے

بارے میں شہنشاہی دربار کی دلچسپی اور اس کا اثر بنائے برائے نام رہ گیا۔ قدیم اور جدید روم کے تعلقات کے ٹوٹنے میں کلیسائی اسباب نے مدد دی۔ دربار سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے قسطنطنیہ کا بطریق (نصاری کا مذہبی پیشوا، پادری، کلیسائی) وقتاً فوقتاً یہ دعوی کیا کرتا تھا کہ اسے کلیسا کے تمام دوسرے حکام پر تقدم وتفوق حاصل ہے۔ شہنشاہ بھی اس اِدّعا کو کسی قدر تسلیم کرتا تھا؛ مگر پوپ نہایت شدت کے ساتھ اسے ناپسند کرتے تھے اور اس سے سیاسی معاملات میں ان کو خودمختاری کے میلان کی تصدیق ہوتی تھی۔ آخر میں بت پرستی کے متعلق اختلاف عظیم برپا ہوا، جس سے یونانی اور رومی مسیحیت کے تمام مغائر میلانات نازک حد کو پہنچ گئے۔ کلیسا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

پوپ کی سیاسی حیثیت میں سب سے زیادہ کمزور نقطہ اس کا وہ تعلق تھا جو روم کی آبادی کے ساتھ تھا۔ قدیم شہنشاہی کے زمانے سے نئے اسقف (اسقف یا بشپ مسیحی دینی پیشوا کو کہا جاتا ہے۔) کے انتخاب کے موقع پر اکثر عام شورش اور خونریزی ہو جایا کرتی تھی، ازمنۂ وسطی کو جنم دینے والے حالات کی بدولت یہ عہدہ ان امیر خاندانوں کے تحت آ گیا جنہوں نے شہر کو باہم تقسیم کر لیا تھا۔ عام طور پر یہ کہنا چاہیے کہ ازمنۂ وسطی (یورپ کی تاریخ عام طور پر عہدِ عتیق کی قدیم تہذیب، قرونِ وسطیٰ اور زمانۂ جدید کے درمیان تقسیم کی جاتی ہے۔ مغربی یورپ کا ازمنۂ وسطیٰ رومی سلطنت کی تقسیم (مغربی رومی سلطنت اور مشرقی بزنطینی سلطنت کے درمیان) اور غیر مہذب اقوام کے حملوں یعنی 5ویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر 16ویں صدی میں پروٹسٹنٹ اصلاحِ کلیسیا (Protestant Reformation) کے دوران مسیحیت کی فرقہ بندی، فتح قسطنطنیہ اور سمندر پار جستجو کے لیے دنیا بھر یورپی توسیع کے آغاز پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی یہ ایک ہزار سے زائد سال کا دور ہے جسے ازمنۂ وسطیٰ کہا جاتا ہے۔) کی اس ختم ہونے والی صدی کا فلسفہ ان تصورات پر محتوی تھا جو اقتدارِ اعلی، حکومت کی عمومی بنیاد، فطری قانون، حقوق اور معاشرتی معاہدے سے متعلق تھے۔ یہ وہی تصورات ہیں جو مادی زندگی کے تغیر شدہ حالات کے زیر اثر دور جدید کی خصوصیات قائم کرنے والے تھے؛ مگر جن لوگوں نے اپنے کو باقاعدہ تخیل وتفکر کے لیے وقف کر دیا تھا، وہ ہنوز پاپائیت وشہنشاہیت کے قدیم تصورات کے اس قدر زیر اثر تھے کہ وہ اپنے فلسفے کے طرزِ بیان یا مطالب کو ازمنۂ سابقہ کے معیار سے آزاد نہیں کر سکتے تھے۔

۴۔ کشمکش صرف ریاست وکلیسا ہی میں نہیں، شہنشاہِ پاپائیت کے درمیان بھی برپا ہوئی اور ان سب میں تصفیہ کی ایک شکل نظام جاگیرداری (Feudalism) میں تلاش کی گئی؛ مگر وہ بجائے خود

ایک سیاسی مصیبت ثابت ہوا۔ ٹیوٹنوں کے سیاسی تصورات کا اثر زیادہ تر ادارات پر پڑا تو مسیحیت کا رومی سیاسی فلسفہ پر؛ جب کہ نظام جاگیرداری کا دائرہ بالکل عملی تھا۔ ''کسی دو نظاموں میں اتنی زیادہ مغایرت نہیں پائی جاسکتی جتنی کہ مغایرت مقدس رومی سلطنت (جو صرف لوگوں کے ذہنوں پر حاوی تھی) اور واقعی جاگیردارانہ حکومت (جس میں عملاً لوگ رہتے تھے) میں پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان جو لطیف اختلافات تھے، ان کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوسکتا ہے'' (ان میں) سے ایک (طاقت) مرکزی تھی تو ایک مقامی، ایک بلند و عظیم نظریہ پر مبنی تھی تو دوسری نراجیت کی غیر مہذب اولاد (Rude - Offspring) ایک نے تمام قوت غیر ذمہ دار حکمران کے ہاتھوں میں مرتکز کرنے کی کوشش کی تو دوسرے نے اس کے حقوق کو محدود کرنے اور اس کے احکام کے خلاف شدید مزاحمت کی سعی کی، ایک کا مطالبہ تمام شہریوں کی برابری اور مساوات کا تھا؛ کیونکہ وہ (مالک) آسمان کی یکساں مخلوق ہیں جو دوسرے نے (اشرافیہ) کے افتخار اور دوسرے درجات کے امتیازات (چشم یورپ نے جو اب تک نہ دیکھے تھے) تک محدود رکھا۔ (نقوش کا رسول نمبر، جلد پنجم، صفحہ 19-21)

متذکرہ سطور و شواہد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق سے عرض کی جاسکتی ہے کہ روم کا سیاسی نظام نوعِ انسانی کے لیے بہت زیادہ مفید و معاون نہیں تھا، اس کا نام تو ''بہبود عام'' رکھا گیا تھا؛ لیکن وہ نظام اس لیے کمزور ہوگیا تھا کہ وہاں پاپائیت اور شہنشاہیت کے باہمی نزاع نے سماجی حقائق اور ان کی ضرورتوں سے بہت زیادہ کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ روم کے امراء اور وزراء کھلے عام سماجی ضرورتوں سے پہلوتہی اختیار کرتے تھے اور عوامی فلاح و بہبود سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔

* * *

اوقاف کا تحفظ اور ہماری ذمہ داریاں

از: ڈاکٹر مفتی تنظیم عالم قاسمی
استاذ حدیث دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

اسلام کے دیگر احکام اور تعلیمات کی طرح وقف بھی اسلامی تعلیمات کا حصہ ہے۔ جس طرح نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ آسمانی چیزیں ہیں انسانی عقل ودماغ کا ان میں کوئی دخل نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح وقف کے احکام بھی آسمانی ہیں۔ دوفرد، دوگروہ یا دوسماج کے باہمی معاہدہ کا نام وقف نہیں ہے کہ اس میں تغیر وتبدل کیا جاسکے؛ بلکہ اس کا ذکر قرآن وحدیث میں موجود ہے، اس کے بارے میں مکمل ہدایات دی گئی ہیں اور اس کی جزئیات اسی طرح کتابوں میں مذکور ہیں جس طرح نماز کے مسائل بیان کے گئے ہیں۔ فقہ کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں اس کے احکام موجود نہ ہوں اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو چیزیں آسمانی ہوتی ہیں ان میں بندوں کو کسی طرح کے تغیر وتبدل کا اختیار نہیں ہوتا؛ بلکہ بندوں کی ذمہ داری ہے کہ اس پر عمل کریں اور جب کوئی آنچ آئے تو اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کریں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللّهَ بِهِ عَلِيمٌ (آل عمران ۹۲) ''تم اپنی پسندیدہ چیزیں خرچ کیے بغیر ہرگز نیکی نہیں پاسکتے اور جو کچھ نیک نیتی سے خرچ کروگے اللہ اسے جاننے والا ہے''.... سیدنا حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے پاس مدینہ میں کھجور کے کئی باغات تھے جن میں ''بیرحا'' نامی باغ انھیں سب سے زیادہ پسند تھا، یہ باغ مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھا، رسول اکرم ﷺ بسا اوقات اس باغ میں تشریف لے جاتے، میٹھا پانی نوش فرماتے اور آپ کی مہمان نوازی کی جاتی، جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوطلحہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے قیمتی اور محبوب مال طلب کیا ہے اور مجھے اس سے

اچھا کوئی مال پسند نہیں ہے، یہ اللہ کے راستہ میں وقف ہے، اس کے بدلے میں اللہ کے یہاں اجر و ثواب کا ذخیرہ پانا چاہتا ہوں، آپ اسے جہاں چاہیں خرچ کیجیے، آپؐ نے اس پر اپنی غیر معمولی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ تمہارا جذبہ میں نے دیکھا اور تمہاری بات سن لی؛ لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس کو اپنے رشتہ داروں اور اہل خاندان کے درمیان تقسیم کردو (کیوں کہ اسلام یہ پسند نہیں کرتا کہ ایک شخص کے مال سے دنیا فائدہ اٹھائے اور خاندان والے بھوکے مریں یا وہ دوسروں سے زیادہ ضرورت مند ہوں) انھوں نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کے حکم کے مطابق ایسا ہی کروں گا؛ چنانچہ انھوں نے اسے اپنے اقرباء کے درمیان تقسیم کردیا (صحیح بخاری-۱۴۶۱)۔

اس طرح بہت سے صحابۂ کرامؓ نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق راہ خدا میں مال خرچ کیا۔ حضرت ابوالدحداحؓ نے چھ سو درختوں پر مشتمل ایک باغ خرچ کردیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے خیبر میں جو باغ ملا تھا اسے اللہ کے راستے میں دے دیا تھا، حضرت عثمان غنیؓ نے سب سے زیادہ مال دیا اور آج تک مدینہ میں ان کا وقف کردہ باغ موجود ہے؛ بلکہ بینک میں ان کے نام سے آج بھی کھاتہ چلتا ہے۔ غرض جن کے پاس جو کچھ تھا اس میں سے کچھ ضرور وقف کیا اور راہ خدا میں خرچ کیا، یہ سلسلہ بعد میں چلتا رہا۔ تابعین، تبع تابعین اور بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے بڑی تعداد میں وقف کیا؛ تاکہ قیامت کے دن اس کا ثواب پاسکیں، وقف کا یہ عمل آج بھی جاری ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

وقف سے متعلق یہاں جاننا چاہیے کہ واقف جب کوئی مال وقف کرتا ہے تو وہ اس کی ملکیت سے نکل کر اللہ کی ملکیت میں چلا جاتا ہے، کوئی انسان اس کا مالک نہیں رہتا، متولی کو بھی اس میں کسی طرح کے تصرف کا اختیار نہیں رہتا؛ بلکہ وہ صرف ایک نگراں ہوتا ہے؛ تاکہ اس وقف کا واقف کے منشا کے مطابق صحیح استعمال ہوسکے۔ متولی اور نگراں کے لیے اشیائے موقوفہ کا خریدنا، بیچنا، کسی کو ہبہ کرنا، ان میں کسی طرح کی تبدیلی وتصرف جائز نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ کسی مسجد میں اگر کسی نے کوئی قرآن کریم وقف کیا تو مسجد کی کمیٹی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس کو وہ دوسری مسجد میں منتقل کرے؛ کیوں کہ واقف نے اسے اس مسجد کے مصلیوں کے لیے وقف کیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وقف کا قانون کتنا سخت اور قابلِ اعتنا ہے۔ صدقہ اور وقف میں فرق یہ ہے کہ صدقہ جس کو دیا جاتا ہے وہ اس کے اصل کا مالک بن جاتا ہے وہ جہاں اور جیسا چاہے خرچ کرے، وہ ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہتا؛ بلکہ اس کا وجود فنا ہوجاتا ہے اور وقف میں اصل باقی رہتا ہے اس کے منافع اور ثمرات

سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔ محتاج، غربا، مساکین اور ضرورت مند حضرات کو اس کے منافع سے استفادہ کا حق حاصل ہوتا ہے۔

وقف سے واقف کا منشا دراصل اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کا قرب، اس کی محبت اور ثواب جاریہ حاصل کرنا ہوتا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ اس سے غربا، اور مساکین فائدہ اٹھاتے رہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شئ موقوف اپنی اصلی ہیئت پر باقی اور محفوظ رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں، بادشاہوں اور نوابوں نے بڑی تعداد میں وقف کیا ہے۔ کسی نے مسجد بنائی اور اس کے لیے ایک بڑی زمین وقف کردی؛ تاکہ اس کی آمدنی سے اس کے اخراجات کی تکمیل ہو، مدرسہ بنایا اور اس کے لیے وقف کیا، درگاہوں کے لیے، مسافر خانوں، قبرستانوں، عیدگاہوں، یتیم خانوں کے لیے بڑی بڑی زمینیں وقف کیں، وقف کرنے والے اجر وثواب کے ساتھ چاہتے تھے کہ یہ ادارے کسی کے محتاج نہ رہیں، خود کفیل بن جائیں اور ان کے اخراجات یہیں سے مکمل ہوجائیں۔ اس کی پشت پر چوں کہ آخرت اور رضائے الٰہی کا تصور تھا؛ اس لیے بڑی تعداد میں مسلمانوں نے وقف کیا اور اس طرح ملک میں اوقاف کی زمینیں کثیر مقدار میں ہیں، ایک رپورٹ کے مطابق ریلوے اور فوجی محکمہ کے بعد سب سے زیادہ زمین مسلم اوقاف کے پاس ہے، تقریباً نو لاکھ ساٹھ ایکڑ زمینیں اوقاف میں درج ہیں اور یہ ساری زمینیں مسلمانوں کے لیے ہیں۔ ان میں مساجد، مدارس، عیدگاہیں، قبرستان، یتیم خانے، درگاہیں اور مسافر خانے ہیں اور یہ تمام اسلامی ضروریات اور شعائر کے لیے ہیں۔ ایک مسلمان ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، یہ سب چیزیں مسلمانوں کے ایمان وعقائد کا حصہ ہیں؛ لیکن افسوس کہ پچھلے کئی دہوں سے یہ کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں سے وقف کی یہ زمینیں چھین لی جائیں اور انھیں ان اداروں سے محروم کردیا جائے؛ تاہم یہ شرپسند عناصر اس منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے؛ لیکن اسلام دشمنی میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اب برسر اقتدار حکومت کے کارندے اس دشمنی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں اور مسلسل مسلمانوں کو حیران وپریشان کرنے اور انھیں دین سے دور کرنے کے حربے اختیار کررہے ہیں۔ ان ہی حربوں میں سے وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴ء ہے جو تمام تر خرابیوں کے باوجود پارلیمنٹ اور راجیہ سبھا میں پاس ہوگیا ہے اور اب اس بل نے ایکٹ کی شکل اختیار کرلی ہے۔

اس ایکٹ کا نقصان یہ ہوگا کہ مساجد ومدارس، عیدگاہیں، قبرستان، مسافر خانے اور یتیم خانے وغیرہ ہاتھ سے نکل جائیں گے اور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مسلمانوں کو اوقاف کی اراضی پر قائم ان

اداروں سے محروم کر دیا جائے گا اور جب یہ ادارے ختم ہو جائیں گے تو مسلمانوں کے ایمان و یقین کا تحفظ اور خود ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ ان کی جان، مال، عزت و آبرو سب کو شدید نقصان ہوگا؛ اس لیے کہ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ ادارے ڈھال کی مانند ہیں، ان کے سبب مسلمان محفوظ ہیں اور کی جان و مال محفوظ ہے۔ اس ایکٹ میں یہ کہا گیا ہے کہ اوقاف کو حکومت جہاں چاہے گی حسبِ صواب دید خرچ کرے گی؛ جب کہ اوقاف کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرنے کا حق خود مسلمانوں کو نہیں ہے، اس کے اصول و قوانین آسمانی ہیں اس میں کسی طرح کا تغیر درست نہیں ہے۔ پھر واقف کے منشا کے خلاف اسے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ کسی مسجد کے لیے دس ایکڑ زمین وقف ہے، حکومت اس ایکٹ کا سہارا لے کر کہہ سکتی ہے کہ مسجد کو اتنی زمین کی ضرورت نہیں ہے؛ لہٰذا باقی اراضی پر اسکولس، کالجز، دواخانے اور دیگر رفاہی ادارے قائم کیے جائیں گے یا انھیں غربا میں تقسیم کیا جائے گا تو اسے روکا نہیں جا سکے گا اور اس طرح وقف کی زمین سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ اسی طرح اس ایکٹ کا ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ وقف اسی زمین کو تسلیم کیا جائے گا جو حکومت کے پاس رجسٹرڈ ہو۔ ظاہر ہے کہ مسلم اوقاف کے پاس بیشتر زمینیں رجسٹرڈ نہیں ہیں؛ کیوں کہ پہلے لوگ زبانی وقف کیا کرتے تھے اور اسی پر اعتماد کر لیتے تھے۔ اسلام میں وقف کے لیے بول دینا کافی ہے اس کا باضابطہ لکھنا یا رجسٹری کرنا ضروری نہیں ہے اور نہ پہلے زمانہ میں اس کے لیے منظّم کوئی طریقہ تھا۔ اسی لیے ۱۹۹۵ء میں وقف بائے یوزر کو وقف تسلیم کیا گیا تھا کہ جو زمین کسی مسجد، مدرسہ، مذہبی کام کے لیے استعمال ہو رہی ہے تو اس کو وقف ہی مانا جائے گا؛ مگر اب اس کو ختم کر کے رجسٹری ضروری قرار دی جائے تو اندازہ کیجیے کہ کتنی زمین مسلمانوں کے پاس باقی رہے گی اور اگر کسی زمین کے بارے میں اختلاف ہوا کہ یہ زمین وقف کی ہے یا نہیں؟ تو اب عدالت جانے کے بجائے ضلعی مجسٹریٹ کو اس کے بارے میں فیصلہ کا حق حاصل ہوگا اور کس ذہن کے لوگوں کے پاس یہ عہدہ اور منصب ہے وہ سب پر عیاں ہے، وہاں بھی ناکامی ہی ناکامی ہوگی۔ پھر اس میں یہ بھی درج ہے کہ جس شخص کے اسلام پر کم از کم پانچ سال کا عرصہ گذر گیا ہو وہی وقف کر سکتا ہے اسی کا وقف قابل قبول ہوگا یہ بھی مزاج شریعت کے خلاف ہے کیوں کہ اسلام میں اس کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ کوئی غیر مسلم بھی مسجد اور مدرسہ کے لیے زمین وقف کر سکتا ہے، اس کا وقف معتبر ہوگا۔ وقف کمیٹی میں کم از کم دو غیر مسلموں کی شمولیت کی شرط بھی اس ایکٹ پر سوالیہ نشان قائم کرتا ہے؛ جب کہ یہ شرط کسی اور مذہب کے وقف میں نہیں ہے۔ اس طرح کے دیگر دفعات بھی ہیں جو براہِ راست اسلامی اصول سے معارض

ہیں اوران کوقبول کرنے کا مطلب اپنی اوقافی جائداد کوطشت میں سجا کر دشمنوں کو پیش کر دینا ہے۔اسی لیے تجزیہ نگاروں نے کہا ہے کہ یہ قانون غیر آئینی اور اقلیت دشمن ہے۔مسلمانوں کو سماجی، معاشی اور مذہبی طور پر کمزور کرنے کا حیلہ بہانہ ہے؛ اسی لیے مسلمان اس بل کی مخالفت کررہے ہیں اوراس قدر پریشان ہیں کہ آزادی کے بعد اتنا بے چین کبھی نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے کہ اس ترمیمی بل کے مضمرات دوررس نتائج کے حامل ہیں جن کو سمجھنے کی ضروت ہے۔

اس سے اتنا تو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس بل کو واپس لینے تک جدو جہد کیوں ضروری ہے اور اوقاف کی حفاظت ہم سب کے لیے کیوں لازمی ہے۔ یہاں یہ بھی یادرکھنے کی ضرورت ہے کہ اسلام پر کیے جانے والے حملوں کا جب بھی مسلمانوں کی جانب سے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور اہل ایمان کچھ ہمت جٹا کر شعائر کے تحفظ کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو دوطرح سے ان کو کمزور کرنے کے حربے اختیار کیے جاتے ہیں ایک باہمی اختلاف اور دوسرے خوف و ہراس۔سب سے پہلے یہ لوگ مسلمانوں کی جماعتوں میں اختلاف وانتشار پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کچھ کو پیسہ کا لالچ دے کر، کچھ سے عہدہ اور منصب کا وعدہ کرکے اور کچھ کے جرائم اور کیسز ختم کرنے کے آڑ میں اوراس طرح مسلمان خواتین کی ایک ٹیم تیار کرکے ان سے اپنی تائید میں بیان دلایا جاتا ہے، کچھ مسلمانوں یا کسی ایک فرقہ اور جماعت کو تیار کرکے اجتماعیت سے انھیں نکال لیا جاتا ہے اور یہ تصور دیا جاتا ہے کہ بل کے خلاف ہونے والا یہ احتجاج کچھ ہی مسلمانوں کا ہے، تمام مسلمانوں کی یہ آواز ہے اور نہ سب کی نمائندگی ہے۔ اس طرح احتجاج کی قوت کم ہوجاتی ہے اور آپسی اختلاف سے مقصد کی تکمیل میں بہت حد تک رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے؛ اس لیے اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ مسلمانوں میں کسی بھی صورت میں اختلاف پیدا ہونے نہیں دیں گے۔احتجاج، دھرنا یا کسی بھی عمل میں تمام مسلک اور جماعتوں کی نمائندگی کو لازمی قرار دیا جائے اور صبر وتحمل، عفوودرگذر، حسنِ سلوک، قوتِ برداشت کے ذریعے بہرصورت مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہونے نہ دیا جائے۔

دوسرا طریقہ مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کا ہے۔ ماب لیچنگ، گھروں پر بلڈوزر چلا کر، مارکیٹ میں مسلمانوں کی معیشت کو تباہ کرکے، پرانے کیسز کو ابھارنے کے ذریعے، سرعام چلتے پھرتے مسلمانوں کی ڈاڑھی ٹوپی کا مذاق اڑا کر اور انھیں بلاوجہ مار پیٹ کرکے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اگر کسی مسلمان نے بل کی مخالفت کی جرأت کی تو اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مسلمان دستور کے دائرہ میں بھی رہ کر احتجاج کرنے اور اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کی

ہمت نہیں کر پاتے اور افسوس اس وقت زیادہ بڑھ جاتا ہے جب کہ مسلم قائدین بھی ان کی بھپکیوں سے ڈر کر مفروضہ خدشات اور اندیشوں کے پیش نظر مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ احتجاج میں شدت اختیار نہ کی جائے، ایسا نہ کیا جائے کہ آپ حکومت کی نگاہ میں آجائیں۔ کیا اس سے نوجوانوں کی ہمت نہیں ٹوٹے گی اور وہ کیا آگے بڑھنے کی جرأت کر پائیں گے؟ انھیں تو یہ کہنا چاہیے کہ دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے شعائر کے تحفظ کے لیے جو بھی کیا جا سکتا ہے ہم کریں، قانون کو ہاتھ میں لیے بغیر کیا کسانوں نے طاقتور احتجاج نہیں کیا جس کے سامنے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ کیا مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے؟ اس پر بھی قائدین کو سوچنے اور اپنے انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

اوقاف کے تحفظ کے لیے کوشش اور جدو جہد کسی ایک فرد یا جماعت کی ذمہ داری نہیں؛ بلکہ ہر فرد اور ہر مسلم شخص کی ذمہ داری ہے کہ جو بھی بس میں ہو اپنی اپنی صلاحیتوں اور سطح کے مطابق کوشش کرے اور بل کو واپس لینے تک کوشش کرتا رہے؛ اس لیے کہ خدانخواستہ اگر یہ بل واپس نہ ہوا اور اس کے نتیجے میں اوقاف تباہ ہو گئے، شعائر مٹ گئے تو روز محشر تو ہر ایک سے سوال ہوگا کہ تم نے مساجد و مدارس اور ان شعائر کے تحفظ کے لیے کیا کوشش کی، کوشش کو کامیاب کرنا اور نہ کرنا اللہ کا کام ہے؛ مگر اخلاص کے ساتھ نکل پڑنا اور کمر بستہ ہونا یہ ہمارا عمل ہے جو قابلِ مؤاخذہ ہے؛ مگر شرط ہے کہ چھوٹا بڑا کام صرف اور صرف اللہ کے لیے کیا جائے، اپنی شخصیت سازی، شہرت، کریڈٹ حاصل کرنے کا شوق یا اپنی جماعت کا رول بتانے کا عزم وغیرہ ایسا گھن اور دیمک ہے جو آہنی دیوار کو بھی کھا جاتا ہے اور مشن کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

اس بل کی واپسی کے لیے سب سے پہلے ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور کرتے رہیں، کچھ لوگوں کو دعا پر یقین نہیں ہوتا، ان کا خیال ہے کہ اسباب میں ساری قوت موجود ہے؛ حالاں کہ یہ غلط ہے، رسول اکرم ﷺ نے جنگ بدر میں اسباب کے طور پر دن میں ان کی صف بندی کی، ان کی تربیت فرمائی، ان کو ہدایات دیں؛ لیکن ساتھ ہی رات بھر آپؐ اللہ سے اگلے دن کی فتح یابی کے لیے دعا کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ صرف اسباب پر یقین نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسباب سے علیحدگی اختیار کی جا سکتی ہے۔ زمین پر فیصلے وہی ہوتے ہیں جو آسمان پر طے ہوتے ہیں، زمین کے فیصلہ کو بدلنے کے لیے آسمان کے فیصلہ کو بدلنا ہوگا اور آسمانی فیصلہ کو بدلنے کے لیے رب کے حضور توبہ، استغفار، ندامت اور عجز و انکساری کو اختیار کرنا ہوگا، تعلق مع اللہ کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا؛ اس لیے اس بل کی واپسی تک خوب دعا کیجیے اور کرتے رہیے، ایک نہ ایک دن ضرور اس رب کو رحم آئے گا جو ساری کائنات پر مہربان

ہے۔اسی طرح اپنی اوقافی جائداد جو رجسٹرڈ نہیں ہے فوری اس کو رجسٹرڈ کرانے کی سعی کی جائے اور اس کی جو بھی صورتیں ہوسکتی ہوں انھیں اختیار کرنے میں سستی سے ہرگز کام نہ لیا جائے۔کاغذات کو صحیح کرنا اور چاق و چوبند رہنا ظاہری اسباب میں سے ہے اس کو اختیار کیا جائے۔قبرستان، عیدگاہ یا کوئی بھی زمین اگر یوں ہی کھلی پڑی ہے تو اس کی فوری احاطہ بندی کر لی جائے، اس لیے کہ کھلی زمین پر شیاطین کی نظر زیادہ ہوتی ہے اور مختلف حیلے بہانے تلاش کیے جاتے ہیں۔ احاطہ بندی سے بہت حد تک فتنے کم ہو جاتے ہیں۔یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ اوقاف کے تحفظ کے لیے جو بھی مثبت کوشش کی جائے اور دستور کے دائرہ میں رہتے ہوئے کی جائے، اس کا ہم حصہ بنیں اور اپنی ضروریات میں سے وقت نکال کر بھرپور ساتھ دیں۔اسی طرح مضامین و مقالات اور وعظ و بیان کے ذریعے اس بل کے مضر اثرات کو بتانے اور عام کرنے کی ضرورت ہے ورنہ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب اوقافی اراضی پر ایک بھی یونیورسٹی، کالج اور ہاسپٹل نہیں ہے تو اس کے رہنے اور نہ رہنے سے کیا فرق پڑتا ہے، ابھی تک ایک بڑا طبقہ اس بل کی خرابیوں اور نقصانات سے ناواقف ہے۔

اسی کے ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے اوقاف کی اراضی پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے ان کے خلاف بھی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔اوقاف مافیاؤں سے اوقاف کو ہر حال میں بچایا جائے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، آج یہ بل جو پاس ہوا ہے اور ہمارے اوپر آفت آئی ہے اس میں ہمارے کرتوت کا بھی بڑا حصہ ہے۔قبرستان کی جو زمین آج سے دس سال پہلے دس ایکڑ تھی، وہ سکڑتے سکڑتے دو ایکڑ بچ گئی، چاروں طرف سے مسلمانوں کی بلڈنگیں بن گئیں۔اس پر قبضہ کرنے والے، بیچنے والے، خریدنے والے سب مسلمان ہیں، کوئی غیر مسلم اور اسلام دشمن طاقتوں کا اس میں ہاتھ نہیں ہے۔اسی طرح درگاہوں کی زمین اور اس کی جائداد موروثی بن گئی ہے، باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا ہی اس کا مالک ہوگا اور وہ اسے ذاتی جائداد کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔اوقاف کی جو ملکیت ہیں ان کا معمولی کرایہ وقف بورڈ کو مل رہا ہے؛ جب کہ لینے والے خود دوسروں سے بھاری کرایہ وصول کر رہے ہیں۔اس طرح کے بے ہنگم پن اور ناجائز قبضہ اور استعمال سے ہی دشمنوں کو حوصلہ ملا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے؛ اس لیے ان کے خلاف بھی مہم چھیڑنے کی ضرورت ہے۔اپنی کمی اور کوتاہی کو دور کیے بغیر ہرگز اپنے مقصد میں ہم کامیاب نہیں ہوسکتے۔

* * *

مائیکروفنائنس یعنی چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی ایپلی کیشنز

تحریر وتخریج: ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی

کمپیوٹر سائنس، انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز میں ہونے والی ترقی کی وجہ سے معاشی و مالیاتی نظاموں کی جدید شکلیں وجود میں آ رہی ہیں۔ نیز اس وقت ترقی یافتہ ممالک میں قرضہ فراہم کرنے کے حوالے سے نت نئے طریقے بھی عوام کے سامنے تجربات کے لیے لائے جا رہے ہیں۔ ان نت نئے مالی معاملات میں سے کچھ کے پیچھے انسانیت کی بھلائی کا جذبہ کارفرما ہے؛ جب کہ کچھ کے پیچھے لالچ اور ہوس ہے۔ نیز چونکہ آج کل کے جدید معاشی نظام میں مائیکروسیکنڈز کے حساب سے مالی معاملات کی انجام دہی کی جارہی ہے اور بعض لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نت نئے مالی معاملات بھی مارکیٹ میں متعارف کروا چکے ہیں؛ لہٰذا عالمی سطح پر اسی پیش رفت کی وجہ سے پاکستان میں بھی مائیکروفنائنس یعنی چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی کئی ایپلی کیشنز (لون ایپس) کا آغاز ہو چکا ہے جن کے ذریعے صارفین موبائل فون کے ذریعے چھوٹے قرضے (مائیکروفنائنس) حاصل کر سکتے ہیں اور صارفین کو یہ قرضہ محدود مدت میں واپس کرنا پڑتا ہے۔

آج سے کچھ سالوں پہلے بڑے قرضوں کے حصول کے لیے بینکوں سے رجوع کرنا پڑتا تھا، پھر چھوٹے قرضوں کی فراہمی کا سلسلہ شروع ہوا جس سے مائیکروفنائنس بینکنگ کا نظام وجود میں آیا۔ پھر حال ہی میں مختلف کمرشیل کمپنیوں اور اداروں کو چھوٹے قرضے فراہم کرنے کا لائسنس جاری ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں موبائل فون کمپنیاں سرفہرست تھیں جو کہ موبائل فون اور انٹرنیٹ کی سہولیات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ قرضہ بھی فراہم کرنے لگیں۔ کچھ کمپنیاں چھوٹے قرضے مختلف عنوانات سے جاری کرتی ہیں جن میں اسکول کی فیس، کاروبار کے لیے قرضہ، گاڑی کی خریداری کے لیے قرضہ اور کاشتکاری کے لیے قرضہ کی فراہمی تک شامل ہیں۔

چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی ایپلی کیشنز (لون ایپس) سے قرضے کی فراہمی اتنی آسان ہوگئی ہے کہ صرف چند گھنٹوں میں قرضے کا حصول ممکن ہے۔ چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی یہ ایپلی کیشنز کبھی سود سے پاک مالیاتی خدمات فراہم کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں تو کبھی تجارت کا عنوان، کبھی سیکورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان کا لائسنس دکھاتی ہیں تو کبھی شریعہ ایڈوائزر کا جاری کردہ فتویٰ، غرض عوام الناس کے سامنے مختلف طریقوں سے اپنی ایپلی کیشنز کی ترویج واشاعت کرتی ہیں۔ بعض مرتبہ چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی یہ ایپلی کیشنز اسلامک فنانس کے عنوان سے اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں۔ عوام الناس کو؛ چونکہ شرعی معاملات کا گہرائی سے علم نہیں ہوتا؛ لہٰذا وہ سیکورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان کا لائسنس اور شریعہ ایڈوائزر کے جاری کردہ فتویٰ پر بھروسہ کرتے ہیں اور ان ایپلی کیشنز سے چھوٹا قرضہ لے لیتے ہیں۔ جب ان ایپلی کیشنز کا گہرائی میں جائزہ لیا گیا تو چشم کشا تفصیلات سامنے آئیں۔ ہم اپنے قارئین کے سامنے ان ہی میں سے ایک ایپلی کیشن کے کام کا طریقۂ کار پیش کرتے ہیں۔

چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی ایک ایپلی کیشن کا طریقۂ کار یہ ہے کہ اگر کسی کو دس ہزار 10,000 روپے قرض درکار ہوں تو وہ اس ایپلی کیشن کے ذریعے قرض کی درخواست دے گا۔ یہ ایپلی کیشن صارف کے کوائف کی جانچ پڑتال کے بعد کچھ گھنٹوں کے اندر دس ہزار 10,000 کی رقم فراہم کردے گی۔ اگر صارف نے قرضہ لیتے وقت ایک ماہ میں یہ رقم لوٹانے کو کہا ہے تو ایک ماہ بعد صارف کو بارہ ہزار دوسو پچاس 12,250 روپے واپس کرنے ہوں گے (جب کہ پندرہ 15 دن میں لوٹانے کی صورت میں گیارہ ہزار ایک سو پچیس 11,125 روپے لوٹانے ہوں گے)۔ بارہ ہزار دوسو پچاس 12,250 روپے جو صارف کو لوٹانے ہوں گے اس میں اس ایپلی کیشن کا مقرر کردہ اے پی آر (Annual Percentage Rate - APR) جو کہ تقریباً دوسو تہتر 273.75 فیصد ہے شامل ہے، جب کہ یہ کوئی فیس چارج نہیں کرتے یعنی فیس صفر روپے ہے۔

اس قرضہ فراہم کرنے والی ایپلی کیشن کی ویب سائٹ پر مہیا کی گئی معلومات کے مطابق اس میں کوئی پروسیسنگ فیس شامل نہیں ہے اور نفع کی شرح روزانہ اشاریہ پچھتّر فیصد 0.75% ہے جو کہ دو ہزار دوسو پچاس 2,250 روپے بنتے ہیں۔ تاخیر سے ادائیگی کا خیراتی عطیہ پچھتّر 75 روپے ہے (مثال کے طور پر ایک دن کی تاخیر کے لیے پچھتّر 75 روپے کا خیراتی عطیہ ادا کرنا ہوگا، جو پرنسپل اور نفع میں شامل ہوگا اور یہ رقم چیریٹی صدقہ وفلاحی کاموں میں جائے گی)۔

اس قرضہ فراہم کرنے والی ایپلی کیشن کی ویب سائٹ پر درج ہے کہ یہ کمپنی سود سے پاک

مالیاتی خدمات فراہم کرتی ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ سود نہیں؛ بلکہ تجارت ہے۔ اس کا طریقۂ کار انھوں نے یوں بیان کیا ہے کہ جب صارف کو دس ہزار 10,000 روپے دیے جاتے ہیں، تو بنیادی طور پر سب سے پہلے وہ اپنے پارٹنر (ایک کموڈیٹی بیچنے والے) سے کموڈیٹی خریدتے ہیں دس ہزار روپے کی۔ پھر کموڈیٹی بیچنے والا اس کموڈیٹی کی ملکیت اس پارٹنر کو منتقل کر دیتی ہے۔ اس کے بعد پارٹنر یہ کموڈیٹی (سامان) صارف کو بارہ ہزار دو سو پچاس 12,250 روپے کی مؤخر ادائیگی (Deferred Payment) کی بنیاد پر فروخت کرتا ہے، جس میں قیمت مع نفع شامل ہے۔ اس کے بعد صارف یہ کموڈیٹی کیش قیمت پر مارکیٹ قیمت پر (دس ہزار روپے) میں کموڈیٹی خریدنے والے کو بیچ دیتا ہے۔ کموڈیٹی خریدنے والا کیش پیمنٹ دس ہزار روپے صارف کو دے دیتا ہے۔ اس طریقے سے صارف کو دس ہزار روپے کیش قرضہ مل جاتا ہے۔ یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ صارف کو یہ سارا عمل نظر نہیں آ رہا ہوتا، وہ تو بس موبائل ایپلی کیشن پر دس ہزار قرضہ کی درخواست دیتا ہے اور یہ سارا عمل پیچھے ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر جب صارف کو قرضہ لوٹانا ہوتا ہے تو وہ بارہ ہزار دو سو پچاس 12,250 روپے پارٹنر کو مؤخر ادائیگی کی مد میں ادا کرے گا مستقبل کی تاریخ پر۔ اس پر یہ پورا عمل انجام پاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ تمام عمل ایپلی کیشن خود انجام دیتی ہے اور صارف دس ہزار 10,000 روپے کی درخواست دے گا اور ایک ماہ بعد بارہ ہزار دو سو پچاس 12,250 روپے واپس کرے گا۔ اس ایپلی کیشن کو سیکیورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن (SECP) نے منظور کیا ہے اور ان کے پاس شریعہ ایڈوائزر بھی ہیں۔

اس ایپلی کیشن کی ویب سائٹ پر ایک فتویٰ موجود ہے جس میں تحریر ہے کہ یہ ایپلی کیشن مختلف ٹیلی کمیونیکیشن سروس پروائیڈرز سے مخصوص ایئر ٹائم خریدتی ہے اور اسے اپنے ان صارفین کو فروخت کرتی ہے، اور یہ فروخت مؤخر ادائیگی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اس کے بعد صارفین کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ ایئر ٹائم کو اپنے موبائل سم میں منتقل کریں یا ایک ایجنٹ مقرر کریں جو ایئر ٹائم کو اپنے کسٹمرز/ریٹیلرز کو فروخت کرے اور فروخت کی کامیابی پر صارفین کو نقد رقم فراہم کرے۔ مالی نظم وضبط کو فروغ دینے اور بروقت قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کو روکنے کے لیے یہ ایپلی کیشن صارفین کی اپنی مرضی کے مطابق چیریٹی جمع کرتی ہے اور اس کو صارفین کی جانب سے خیراتی مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔

چونکہ یہ ایپلی کیشن ایئر ٹائم کو استعمال کرتی ہے، لہٰذا ہم ایئر ٹائم کی تعریف بیان کرتے ہیں۔

ائیر ٹائم کی تعریف یہ ہے کہ جتنی دیر موبائل فون پر صارف کال، میسج یا انٹرنیٹ استعمال کرتا ہے اس ائیر ٹائم کہا جاتا ہے۔ ایئر ٹائم Airtime پیدا نہیں ہوتا، خرچ نہیں ہوتا؛ بلکہ انٹرنیٹ سروس مہیا کرنے والے یا موبائل فون کمپنیاں صرف اس بات کا حساب رکھتے ہیں کہ کس نے کتنا انٹرنیٹ ایئر ٹائم استعمال کیا، یا کال کی یا میسج کیے اور پھر اسی کے حساب سے اپنے اخراجات اور منافع کو ذہن میں رکھتے ہوئے صارفین سے فیس مختلف پیکیجز کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔

اس قرضہ فراہم کرنے والی ایپلی کیشن کے کام کا طریقۂ کار اور تکنیکی تفصیلات مع چند سوالات پاکستان بھر کے مستند دارالافتاء اور مفتیانِ کرام کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ہم پہلے وہ سوالات قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

سوال نمبر۱: کیا اس طریقے سے قرض لینا جائز ہے؟ اگر کسی نے 10,000 روپے کا قرض لیا اور اسے ایک ماہ بعد 12,250 روپے کی صورت میں واپس کر رہا ہے تو کیا یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

سوال نمبر۲: اس ایپلی کیشن کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان میں اگر ایک دن میں دس ہزار افراد 10,000 روپے قرضے کی درخواست کرتے ہیں الگ الگ اور انھیں یہ قرض چند گھنٹوں میں مل جاتا ہے تو کیا یہ عملی طور پر ممکن ہے؟ یعنی اگر ہم اصلی کموڈٹی کی بات کریں جیسے گیہوں، چاول وغیرہ تو ان کو رکھنا، ان کو بیچنا مشکل کام ہوگا۔ اس کمپنی نے بجائے ان حقیقی کموڈٹی کے ائیر ٹائم کو بطور کموڈٹی اختیار کیا ہے۔ جب یہ کمپنی دس ہزار 10,000 روپے کی کموڈیٹی (ایئر ٹائم) خرید رہی ہو اور پھر اسے بارہ ہزار دو سو پچاس 12,250 روپے میں صارفین کو بیچ رہی ہو؛ کیونکہ یہ قرض چند گھنٹوں میں فراہم کرتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ صارفین کی تعداد بڑھتی چلے جائے گی تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ شرعی طور پر مناسب ہے؟

سوال نمبر۳: جب یہ طریقۂ کار اختیار کیا جا رہا ہے کہ ایک کمپنی ہے جو قرضہ دے رہی ہے اور بڑے پیمانے پر دے رہی ہے اور عنوان بھی قرضے کا ہی ہے اور لوگ قرضہ ہی لے رہے ہیں؛ لیکن اس کے پیچھے طریقۂ کار فائیننس کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ فنانس کوئی طریقۂ کار ہے تو اتنے بڑے پیمانے پر اس کو قرضہ کے عنوان سے کیوں متعارف کیا جا رہا ہے؟ یعنی صارف کا مقصد قرضہ لینا ہے تو قرض تو شریعت میں بطور احسان کے لیا جاتا ہے اور اس پر منافع لینا سود ہے۔ قرض دینے والے اگر مقروض کو کوئی رعایت دیتا ہے قرضہ واپس لینے میں تو اس کو آخرت میں ثواب ملے گا۔ تو سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر قرضہ فراہم کیا جا رہا ہے اور اس کے پیچھے فنانس کو استعمال

کیا جارہا ہے۔ کیا ایسا کرنا شرعی طور پر مناسب ہے؟ یعنی اگر کوئی کمپنی یہ کہے کہ ہمارے پاس انویسٹ کریں اور ہم آپ کو منافع دیں گے، تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے؛ لیکن یہاں تو صارف کو قرضہ چاہیے اور وہ قرضہ لے بھی رہا ہے، اور واپسی میں زیادہ پیسے دے رہا ہے۔ پھر اس عمل کو تمویل یا فنانسنگ کا نام کیوں دیا جارہا ہے؟

سوال نمبر۴: یہاں بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ ایک کمپنی قرض دینے کے نام پر فنانسنگ کا عمل انجام دے رہی ہے۔ اگر یہ کمپنی انویسٹمنٹ یعنی سرمایہ کاری کے طور پر منافع دینے کا اعلان کرے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے؛ لیکن یہاں تو صارف قرض لے رہا ہے اور اسے زیادہ رقم واپس کرنی ہوتی ہے۔ مفتی صاحب، کیا اس طرح کا عمل جائز ہے؟ کیا ایسا کرنا درست ہے؟

سوال نمبر۵: اور کیا اس طرح بڑے پیمانے پر کمپنیوں کو اس بات کی اجازت دینا کہ وہ قرضے کے نام پر فنانسنگ کررہی ہوں، مناسب عمل ہے؟ پوری معیشت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پورے پاکستان میں یہ جو سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن (SECP) لائسنس جاری کررہا ہے، یہ عملی طور پر رائج ہوچکا ہے اور لوگ قرضے لے رہے ہیں۔ کیا یہ اصولی طور پر صحیح ہے؟

سوال نمبر۶: جب ہم روزمرہ کی زندگی میں کسی سے قرضہ لیتے ہیں تو وہ بطور احسان ہمیں قرضہ دیتا ہے اور ہم اس کو کچھ عرصے بعد لوٹانے کو کہتے ہیں اور اس میں شرعی طور پر وہ ہم سے کوئی چیز گروی بھی رکھ سکتا ہے۔ ہم جب اس کو قرضہ لوٹائیں گے تو وہ مالیت وہی ہونی چاہیے جو اس نے قرضہ دیتے وقت دی تھی ورنہ اضافہ سود کہلائے گا۔ اگر کسی نے روپے میں قرضہ لیا ہے اور چونکہ روپے کی گراوٹ کی وجہ سے اگر وہ یہ کہے کہ تین سال پہلے تم نے دو لاکھ روپے قرضہ لیا تھا، اب چونکہ روپے کی قدر میں گراوٹ آئی ہے اور ہم اتنی مالیت کے اثاثے اس سے نہیں خرید سکتے؛ لہٰذا زیادہ پیسے دیے جائیں تو اس کو ہمیشہ سے سود کہا جاتا رہا ہے۔ اگر کسی کو قدر کو محفوظ رکھنا ہے تو وہ سونے کو بطور قرضہ دے دے، اس سے اگر کچھ سال بعد بھی قرضہ واپس ادا کیا جائے گا تو اس کی قدر برقرار رہے گی۔ تو کیا اب ہمیں قرضے کے نظریہ کو سرے سے شریعت میں سے ختم کردینا چاہیے نعوذ باللہ اور اس کے بجائے جب کوئی شخص قرضہ فراہم کرے تو اس کمپنی کا حیلہ اختیار کرلے۔ تو کیا ایسا کرنا جائز ہوگا؟

سوال نمبر۷: کیا ائیر ٹائم کو بطور کموڈٹی خرید وفروخت کرنا جائز ہے اور اس کمپنی کا اسے بطور کموڈٹی قرضہ کے حیلہ کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے؟

مندرجہ بالا سوالات کے جوابات پاکستان بھر کے جن مستند دارالافتاؤں سے موصول ہوئے ان

میں سے چند کے نام یہ ہیں: دارالافتاء جامعہ دارالعلوم الصفہ کراچی، دارالافتاء جامعہ خیر المدارس ملتان، دارالافتاء جامعہ الحسنین فیصل آباد، دارالافتاء جامعہ دارالعلوم رحمانیہ کراچی، دارالافتاء جامعہ نعیمیہ لاہور، دارالافتاء والتحقیق جامع مسجد ابوبکر صدیق کراچی اور دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی شامل ہیں۔ پاکستان بھر کے یہ تمام مستند مدارسِ دینیہ، جید مفتیانِ کرام اور دارالافتاء چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی اس ایپلی کیشن سے متعلق متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ اس ایپلی کیشن سے قرضہ لینا جائز نہیں اور یہ سود ہونے کی وجہ سے ناجائز وحرام ہے۔

اب ہم قارئین کی سہولت کے لیے ان تمام مستند دارالافتاؤں کے جوابات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

''دس ہزار قرض لینا اور ایک مہینہ بعد بارہ ہزار دوسو پچاس واپس کرنا، قرض پر نفع کا لین دین ہے، جو کہ سود ہونے کی وجہ سے شرعاً ناجائز وحرام ہے''۔ ''کمپنی کا ایئر ٹائم کی بطورِ کموڈیٹی خرید و فروخت چوں کہ قرض پر نفع لینے کا ایک حیلہ ہے، جس کا اختیار کرنا شرعاً جائز نہیں؛ کیوں کہ اس کا مقصد وہی قرض پر نفع لینا ہے، جو کہ سود ہونے کی وجہ سے ناجائز وحرام ہے''۔ ''قرض دے کر اس پر اضافی نفع لینا اور اس کو فائنانسنگ کا نام دینا قطعاً درست نہیں''۔ ''شریعت میں تجارت کی ایسی کوئی صورت جائز نہیں ہے کہ قرضہ دے کر از خود مقروض کو خریدار اور پھر بائع شمار کر کے اضافی رقم کو نفع تصور کیا جائے''۔ ''اس ایپلی کیشن کے پیچھے پاٹنر کا کموڈٹی کی خرید وفروخت کرنا ایک فرضی صورت ہے اور مقروض کو دھوکہ دینا بھی ہے''۔ ''اس کے علاوہ ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے بطور جرمانہ جو خیراتی عطیہ پچھتّر روپے فی یومیہ وصول کیا جاتا ہے یہ بھی ناجائز ہے کہ یہاں قرض کے ساتھ تاخیر کی وجہ سے خیراتی عطیہ دوسری شرط ہے۔ اس طرح مشروط خیراتی عطیہ جبراً لینا جائز نہیں''۔ ''یہ بیع عینہ ہے جو کہ سود کا حیلہ اور ناجائز ہے۔ اس عمل کو فائنانسنگ کا نام اس لیے دیا جارہا ہے کیوں کہ اس میں بیع عینہ کو اختیار کیا گیا ہے جو کہ سودی نفع حاصل کرنے کا تجارتی طریقہ ہے''۔

''یہ محض زبانی اور کلامی ایک دعویٰ اور دھوکہ کے سوا کچھ نہیں؛ اس لیے کہ ''ائیر ٹائم'' موبائل کمپنیاں فراہم تو کرتی ہیں واپس خریدتی نہیں ہیں، مثلاً اگر موبائل فون میں سو روپے کا ایزی لوڈ کروایا جائے تو ٹیکس وغیرہ کی کٹوتی کے بعد وہ کم وبیش نوے روپے میسر ہوتا ہے، پھر اس نوے روپے کو کسی جگہ کیش نہیں کرایا جاسکتا کہ کمپنی موبائل بیلنس کی شکل میں نوے روپے واپس لے کر اس کے بدلے نقد رقم دیدے؛ البتہ اپنے کسی عزیز دوست کو یہ بیلنس شیئر کر کے اس سے نقد رقم وصول کی جاسکتی ہے،

لیکن اس میں بھی کٹوتی ہوجاتی ہے۔اس طرح بیلنس کے خریدار ناپید ہیں،لہٰذا ائیر ٹائم فراہم کرنے اور پھر اس کو مارکیٹ میں بیچنے کا دعویٰ محض زبانی بات ہے،حقیقت یہی ہے کہ کمپنی اکاؤنٹ میں رقم ہی فراہم کرتی ہے۔اگر تسلیم کرلیا جائے کہ کمپنی دس ہزار روپے قرض نہیں دیتی؛ بلکہ دس ہزار روپے کا ''ائیر ٹائم'' ہی دیتی ہے اور مستقرض یہ ''ائیر ٹائم'' اسی کمپنی کو ہی دے کر ان سے رقم وصول کرلیتا ہے تو یہ بیع عینہ کی وہ صورت ہے جس کے مکروہ تحریمی میں کسی کا اختلاف نہیں اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ سودخوروں کی ایجاد کردہ بیع ہے''۔

قارئین غور فرمائیں کہ کس طریقے سے پاکستانی معاشرے میں چھوٹا قرضہ فراہم کرنے والی ایپلی کیشن کو رائج کیا گیا ہے،اس کو استحکام دینے کے لیے مختلف عنوانات دیے گئے؛مگر جب پاکستان بھر کے مستند دارالافتاؤں سے پوچھا گیا تو انھوں نے اس ایپلی کیشن سے قرضہ لینے کو سود قرار دے کر ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ہمیں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیسے اس طرح کی کمپنیوں کو سیکورٹی اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان کی جانب سے لائسنس فراہم کیا گیا؟ کیسے اس کمپنی کی شریعہ ایڈوائزی کمیٹی نے اس قرضہ فراہم کرنے کے معاملہ کے جائز ہونے پر فتویٰ جاری کیا؟ کیا اس کمپنی کے شریعہ ایڈوائزی کمیٹی کے سامنے پاکستان بھر کے مستند دارالافتاؤں کا موقف نہیں؟ ہم امید کرتے ہیں کہ متعلقہ ادارے اور صاحبانِ علم ان تمام گزارشات پر غور فرمائیں گے۔نیز ہم عوام الناس سے بھی گزارش کریں گے کہ وہ کوئی بھی معاملہ انجام دینے سے پہلے پاکستان کے مستند دارالافتاؤں سے رجوع کریں؛تاکہ وہ غیر شرعی معاملات سے بچ سکیں۔

آخر میں ہم قارئین کی خدمت میں اکابرینِ اُمت کے قرض سے متعلق ارشادات پیش کرتے ہیں۔قرض (دَین) سے متعلق شریعت کے واضح احکامات موجود ہیں جن کا خلاصہ حضرت مفتی رفیق احمد بالاکوٹی صاحب دامت برکاتہم اپنے مضمون ''سود اور اس کے متعلقہ مباحث، پہلی قسط، جمادی الأخریٰ ۱۴۳۵ھ-مئی ۲۰۱۴ء، ماہنامہ بینات'' میں تحریر فرماتے ہیں:

* ''قرض ایک معاوضاتی معاملے کے بجائے ایک تبرعاتی معاملہ ہے،جس میں عبادت کا پہلو غالب ہے۔
* قرض دینا صدقہ کرنے سے بھی بڑھ کر عبادت قرار دیا گیا ہے۔
* قرض لینا حاجت پر مبنی ہے،یعنی قرض ضرورتِ شدیدہ کی بنا پر ہی لیا جانا چاہیے۔
* قرض لے کر لوٹانا حقوق العباد میں سے ایک بہت اہم حق ہے،حتیٰ کہ ایک موقع پر اس

کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے شخص پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم نے جنازہ پڑھانے سے بھی انکار فرمادیا۔ اور قرض کی ادائیگی کے باوجود ادائیگی کی استطاعت رکھنے کے ٹال مٹول کرنے کو ظلم فرمایا گیا ہے، جو کہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں اندھیریوں کا سبب ہوگا۔''

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم ''سود پر تاریخی فیصلہ'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''موجودہ سیکولر سرمایہ داری نظام اور اسلامی اُصولوں کے درمیان ایک اور بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام میں قرضوں کا مقصد صرف تجارتی ہوتا ہے؛ تاکہ قرضوں کے ذریعے قرض دینے والے ایک متعین نفع کما سکیں۔ اس کے برخلاف اسلام قرضوں کو نفع کمانے کا ذریعہ قرار نہیں دیتا، اس کے بجائے ان کا مقصد یا تو انسانیت کی بنیاد پر دُوسروں کی مدد کرکے ثواب کمانا ہوتا ہے یا پھر کسی محفوظ ہاتھ میں اپنی رقم کو محفوظ کرنا ہوتا ہے۔ جہاں تک سرمایہ کاری کا تعلق ہے، اسلام میں اس کے لیے دُوسرے طریقے ہیں، مثلاً شرکت وغیرہ، لہٰذا قرضوں کے عقد کے ذریعے نفع اندوزی نہیں کی جاسکتی۔''

* * *

سلف صالحین اور استاذ کا ادب

از: عصمت اللہ نظامانی
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی

اصل موضوع شروع کرنے سے قبل چند باتیں بطور تمہید ملحوظ رہیں:

الف- اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جب تک طالبِ علم کو اپنے دل میں آنے والے سوالات، استاد کی تقریر و درس میں پیدا ہونے والے شبہات، نصابی کتب کی عبارات پر وارد ہونے والے اشکالات استاد کے سامنے پیش کرنے اور انھیں حل کرنے کی اجازت نہ ہو، بالفاظِ دیگر اگر طالبِ علم کو حصولِ علم کے سلسلے میں آزادی اظہارِ رائے حاصل نہ ہو؛ بلکہ ایک قسم کا ذہنی غلام ہو اور اس کو اپنے اساتذہ کی ہر بات آنکھ بند کر کے ماننے کا پابند کیا جائے تو ایسی صورت میں بالیقین طالبِ علم کا نقصان ہوگا اور ایسا کرنا اس کو علم سے محروم رکھنے کے مترادف ہوگا۔ لہٰذا زیرِ نظر مضمون میں ایسی کسی بات کی ترغیب نہیں دی جارہی؛ بلکہ یہ بیان کیا جائے گا کہ حصولِ علم میں معاون مذکورہ بالا تمام امور کی اجازت کے باوجود طالبِ علم اپنے اساتذہ کا ادب اور احترام کرے، جو کہ تحصیلِ علم کے اسباب میں سے اہم سبب ہے۔

ب- جس طرح محترم اساتذہ کے آداب ہیں جن کا لحاظ ہر طالبِ علم پر لازم ہے، اسی طرح طلبۂ کرام کے بھی حقوق ہیں جن کی ادائیگی ہر معلم و استاد پر ازبس ضروری ہے اور اپنے پیشے کے ساتھ وفاداری بھی؛ لہٰذا ان کے حقوق میں کوتاہی سے صرف طلبہ کا نقصان نہیں ہوگا؛ بلکہ معلم بھی اس ضرر سے محفوظ نہیں رہے گا۔

ج- استاد کا ادب و احترام کرنا، ان کی عزت و توقیر، اعزاز و اکرام کرنا، ان کی راحت رسانی و آرام کے سلسلے میں کوشاں رہنا، ان کے سامنے تواضع و انکساری سے پیش آنا اور انھیں ادنیٰ تکلیف و اذیت پہنچانے سے بھی گریز کرنا ہر طالبِ علم پر لازم ہے، خواہ وہ ابتدائی درجات کا متعلّم ہو یا درجاتِ

عالیہ اور دورۂ حدیث وتخصص کا طالب علم ہو۔ اور استاد بھی چاہے بخاری شریف پڑھانے والا ہو، یا علم منطق، ابتدائی صرف ونحو یا علومِ عصریہ کا مدرس ہو۔ بہرصورت ان کا ادب لازم ہے؛ چنانچہ اس بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے:

أُمِرْنَا أن نتواضعَ لِمَنْ نتعلم منه(۱).

ترجمہ: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم جس سے علم حاصل کریں، اس کے سامنے تواضع وعاجزی اختیار کریں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

اعلم بأن المتعلم لاينال العلم ولا ينتفع به إلا بتعظيم العلم وأهله، وبتعظيم أستاذه(۲).

ترجمہ: جان لو کہ طالب علم علم حاصل نہیں کرسکتا اور نہ اس سے نفع اٹھاسکتا ہے؛ مگر علم، علماء اور اپنے استاد کی تعظیم وتکریم سے۔

اور علامہ خادمیؒ ''بریقہ محمودیہ'' میں لکھتے ہیں:

ومن أسباب انقراض العلم عدم مراعاة حق المعلم، قيل: من تأذى منه أستاذه يحرم بركة العلم ولا ينتفع به إلا قليلا(۳).

ترجمہ: علم ختم ہونے کے اسباب میں سے ایک استاد کے حق کی رعایت نہ رکھنا بھی ہے، ایک قول ہے کہ جس سے اس کا استاد اذیت محسوس کرے، وہ علم کی برکت سے محروم رہتا ہے اور اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ دنیا جس طرح حاکم وسلطان کی تعظیم کرتے ہیں، اسی طرح ہمارے اسلاف واکابرین اپنے اساتذہ کا ادب واحترام کرتے تھے؛ چنانچہ امام عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کے بارے میں مشہور تابعی محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں:

رأيت عبد الرحمن بن أبى ليلى وأصحابه يعظمونه ويسودونه ويشرفونه مثل الأمير(۴).

ترجمہ: میں نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کو دیکھا، اس حال میں کہ ان کے ساتھی وشاگرد حاکم وامیر کی طرح ان کی تعظیم اور اعزاز واکرام کرتے تھے۔

ذیل میں مختصر طور پر استاد ومعلم کے ادب واحترام کے سلسلے میں اپنے اکابرین واسلاف کے

فرمودات اور نگارشات پیش کی جارہی ہیں؛ تاکہ طالب علم انھیں حرزِ جان بنا کر اپنے خانۂ دل میں محفوظ کرلے اور ان پر عمل کرے۔

غیر مشہور اساتذہ کے ادب میں کمی

طلبۂ کرام میں یہ کوتاہی بکثرت دیکھی گئی ہے کہ وہ ان اساتذہ کا بہت ادب واحترام کرتے ہیں جو مشہور ہوں، جنہیں تصنیف وتالیف کی وجہ سے شہرت حاصل ہو، یا تقریریں اور بیانات کرنے کی وجہ سے ان کے نام زبان زدِ عام ہوں، یا کسی دوسری وجہ سے مدرسہ کے اندر اور باہر لوگوں میں معروف ہوں؛ لیکن وہ معزز اساتذہ جو شہرت وناموری سے کوسوں دور بھاگتے ہوں، جو ہمہ وقت اپنے درس وتدریس اور مطالعۂ کتب میں مشغول ہوں؛ ان کا زیادہ ادب واحترام نہیں کیا جاتا۔ گویا کہ ادب کا سبب شہرت ہوئی، نہ کہ استاد کا مقام۔

اساتذہ کا ادب کرنے میں یہ درجہ بندی طالبِ علم کے لیے نہایت مُضر اور علم سے محرومی کا باعث ہوسکتی ہے؛ چنانچہ ہمارے اکابر نے اس بات کی طرف طلبہ کو خصوصی توجہ دلائی ہے کہ وہ مشہور وغیر مشہور ہر طرح کے اساتذہ سے استفادہ کریں، اور ان کا ادب واحترام کریں؛ بلکہ بقولِ امام غزالیؒ (ت:505ھ) صرف مشہور استاد سے چمٹ جانا اور غیر مشہور استاد سے استفادہ نہ کرنا تکبر اور بڑی حماقت وبیوقوفی ہے کہ اس سے طالبِ علم اپنے آپ کو علم کی وافر مقدار سے محروم کردیتا ہے؛ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

فلا ينبغي لطالب العلم أن يتكبر على المعلم ومن تكبره على المعلم أن يستنكف عن الاستفادة إلا من المرموقين المشهورين وهو عين الحماقة(۵).

ترجمہ: طالبِ علم کے لیے استاد پر تکبر کرنا صحیح نہیں، اور استاد پر تکبر کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ صرف مشہور ومعروف اساتذہ سے استفادہ کرے؛ حالانکہ یہ پرلے درجہ کی حماقت ہے۔

اور علامہ بدرالدین ابن جماعہؒ (ت:733ھ) رقم طراز ہیں:

وليحذر من التقييد بالمشهورين وترك الأخذ عن الخاملين(۶).

ترجمہ: طالبِ علم کو چاہیے کہ مشہور اساتذہ سے چمٹے رہنے اور غیر مشہور اساتذہ سے ترکِ استفادہ سے بچے۔

معلوم بات کو بھی شوق ورغبت سے سننا

استاد کے احترام کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی بات غور اور توجہ سے سنی جائے اور بوقتِ

درس پورا دھیان استاد اور اس کی تقریر کی طرف ہو۔ بسا اوقات استاد جو چیز پڑھا اور سمجھا رہا ہوتا ہے، طالب علم کو وہ پہلے سے ہی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اس کے باوجود ادب یہ ہے کہ اپنے چہرے یا عمل سے یہ بات ظاہر نہ ہونے دے کہ اس کو بیان کی جانے والی بات معلوم ہے؛ بلکہ شوق ورغبت سے اس طرح سنے، گویا کہ پہلی مرتبہ سن رہا ہے، اور یہی طرز ہمارے اکابرین رحمہم اللہ کا رہا ہے؛ چنانچہ مشہور ومعروف محدث وتابعی عطاء بن ابی رباحؒ فرماتے ہیں:

إني لأسمع الحديث من الرجل وأنا أعلم به منه فأريه أني لا أحسن شيئا منه(۷).

ترجمہ: میں کسی آدمی سے کوئی حدیث سنتا ہوں؛ حالانکہ میں وہ حدیث اس سے زیادہ جانتا ہوں، پھر بھی میں اس پر اس طرح ظاہر کرتا ہوں، گویا کہ میں اس حدیث میں سے کچھ نہیں جانتا۔

اسی طرح ان کا ایک دوسرا قول ہے:

إن الرجل ليحدثني بالحديث، فأنصت له كأني لم أسمعه، وقد سمعته قبل أن يولد(۸).

ترجمہ: کوئی آدمی مجھے حدیث سناتا ہے تو میں غور سے سنتا ہوں، گویا کہ میں نے پہلے کبھی نہ سنی ہو؛ حالانکہ میں وہ حدیث اس شخص کی پیدائش سے بھی پہلے سن چکا ہوتا ہوں۔

اور علامہ ابن جماعہ اس بارے رقم طراز ہیں:

إذا سمع الشيخ يذكر حكمًا في مسألة أو فائدة مستغربة أو يحكي حكاية أو ينشد شعرًا وهو يحفظ ذلك أصغى إليه إصغاءَ مستفيدٍ له في الحال متعطش إليه فرح به كأنه لم يسمعه قط(۹).

ترجمہ: جب طالب علم اپنے استاد کو سنے کہ وہ کسی مسئلہ کا حکم ذکر کر رہا ہو، یا کوئی انوکھا فائدہ یا قصہ بیان کر رہا ہو، یا شعر کہہ رہا ہو، اور طالب علم کو وہ پہلے سے یاد ہو تو بھی وہ اس سے استفادہ کرنے والے کی طرح غور سے سنے، اس کی طرف علم کا پیاسا ہو اور اس پر اس طرح خوش ہو، گویا کہ پہلے وہ بات کبھی نہیں سنی۔

دورانِ درس استاد کی طرف کامل توجہ

استاد کے آداب میں ایک اہم ادب جس میں طلبائے کرام عموماً کوتاہی کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ درس گاہ میں استاد کی موجودگی کے وقت اور بالخصوص دورانِ درس طالب علم کو چاہیے کہ وہ استحضار ذہن کے ساتھ صرف استاد کی طرف متوجہ ہو، ادھر ادھر نہ دیکھے، اگر کلاس اور درس گاہ میں کوئی اجنبی یا

استاد کا مہمان اور جاننے والا داخل ہو، یا کوئی پرندہ اندر آ جائے یا کوئی اور انوکھی بات ہو تو بھی وہ اس کی طرف التفات نہ کرے؛ بلکہ مکمل یکسوئی سے استاد کی جانب متوجہ رہے۔ اس سلسلے میں یہ کمی دیکھی گئی ہے کہ ایک طرف استاد پڑھا رہا ہوتا ہے، دوسری جانب اگر کوئی طالب علم تاخیر سے آتا ہے، یا کسی وجہ سے درس گاہ کا دروازہ کھلتا ہے تو متعدد شاگرد استاد کے درس وتقریر کو چھوڑ کر اس طرف دیکھنے لگتے ہیں، حالانکہ ہمارے اکابر کا یہ حال ہوتا تھا کہ جب وہ استاد کی مجلس اور درس میں شریک ہوتے اور ان کے پاس کسی حاکم کا گزر ہوتا تب بھی وہ اس کی طرف نظرِ التفات نہ کرتے؛ چنانچہ مشہور محدث ابوعاصل النبیل فرماتے ہیں:

كنا عند ابن عون وهو يحدث، فمر بنا إبراهيم بن عبد الله بن حسن في موكبه، وهو إذ ذاك يُدْعٰى إماما، بعد قتل أخيه محمد، فما جسر أحد أن يلتفت فينظر إليه، فضلًا عن أن يقوم هيبة لابن عون(۱۰).

ترجمہ: ہم عبداللہ بن عون کے پاس تھے، وہ حدیث بیان فرمارہے تھے، تو ابراہیم بن عبداللہ بن حسن اپنی سواری میں ہمارے پاس سے گزرا، اُن کے بھائی محمد کے قتل کے بعد اس کو امام کہا جاتا تھا، ہم میں سے کسی ایک نے بھی اُن کو دیکھنے کے لیے اس کی طرف التفات کرنے کی جسارت نہیں کی، چہ جائے کہ اس کے لیے کوئی کھڑا ہوتا اور یہ ابن عون کی ہیبت ورعب کی وجہ سے تھا۔

اس سلسلے میں علامہ ابن جماعہؒ لکھتے ہیں:

فلا ينبغي أن ينظر إلا إليه ولا يضطرب لضجة يسمعها أو يلتفت إليها ولاسيما عند بحث له(۱۱).

ترجمہ: طالب علم کو چاہیے کہ وہ صرف استاد ہی کو دیکھے اور کسی شور کو سن کر مضطرب وفکرمند نہ ہو، اور نہ اس کی طرف متوجہ ہو، خاص طور پر استاد کے دورانِ بحث۔

استاد کو پکارنے کا طریقہ

استاد کے ادب میں یہ بھی شامل ہے کہ استاد کے سامنے طرزِ تخاطب اور بات کرنے کا انداز درست ہو، اس طرح باتیں نہ کرے جس طرح اپنے ساتھیوں اور ہم عمر افراد سے گفتگو کی جاتی ہے، اور ''تم'' وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرے، اس کے بجائے حضرت، آپ، استاد صاحب وغیرہ احترام والے لفظ ذکر کرے، اگرچہ استاد عمر کے لحاظ سے شاگرد سے زیادہ بڑا نہ ہو، جیسا کہ علامہ ابن جماعہ فرماتے ہیں:

وينبغي أن لا يخاطب شيخه بتاء الخطاب و كافه، ولا يناديه مِنْ بُعْدٍ بل يقول: يا سيدي ويا أستاذي(۱۲).

ترجمہ: اور اسے چاہیے کہ وہ اپنے شیخ واستاد کو مخاطب کی تاء اور کاف (عربی میں واحد مخاطب کے لیے تاء اور کاف استعمال کیے جاتے ہیں) کے ذریعے نہ مخاطب ہو اور اس کو دور سے آواز دے کر نہ بلائے؛ بلکہ یا سیدی اور یا استادی کہے!

اساتذہ کی ڈانٹ پر شاگرد کا طرزِ عمل

بسا اوقات طالبِ علم کی کسی کوتاہی کی وجہ سے استاد اس کو ڈانٹتا ہے اور سخت الفاظ استعمال کرتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے استاد کی طرف سے شاگرد کو ڈانٹ پڑے، اگرچہ حقیقت میں اس کی غلطی نہ ہو، تو ایسی صورت میں بھی استاد کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ طالبِ علم صبر سے کام لے، استاد سے ذرہ برابر بھی متنفر نہ ہو اور نہ یہ بات دل میں لے کر بیٹھے؛ بلکہ خود آگے بڑھ کر عفو ودرگذر کا خواہاں ہو اور استاد سے معذرت کرے؛ چنانچہ امام نوویؒ شرح المہذب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

وينبغي أن يصبر على جفوة شيخه وسوء خلقه ولا يصده ذلك عن ملازمته واعتقاد كماله ويتأول لافعاله التي ظاهرها الفساد تأويلات صحيحة.... وإذا جفاه الشيخ ابتدأ هو بالاعتذار وأظهر أن الذنب له والعتب عليه فذلك أنفع له دينا ودنيا(۱۳).

یعنی طالب علم کو چاہیے کہ وہ اپنے شیخ واستاد کی سختی وبدخلقی پر صبر کرے اور یہ بات اس کو اپنے استاد کے پاس پابندی سے جانے اور ان کے کامل ہونے پر یقین رکھنے سے نہ روکے اور اس کے ان افعال کی صحیح تاویل کرے جو بظاہر فاسد لگ رہے ہوں۔۔۔ اور جب استاد اس پر سختی کرے تو وہ خود آگے بڑھ کر معذرت کرے اور اس بات کا اظہار کرے کہ قصور اسی کا ہی ہے اور وہی سرزنش کا مستحق ہے، پس یہ اس کے لیے دین ودنیا کے اعتبار سے زیادہ نافع ہوگا۔

استاد کی جگہ پر بیٹھنے سے اجتناب کرنا

استاد کے آداب میں سے ایک اہم ادب یہ بھی ہے کہ طالب علم استاد کی جگہ پر نہ بیٹھے، لہٰذا اگر استاد کرسی استعمال کرتا ہو، یا مصلی وغیرہ پر بیٹھتا ہو تو استاد کی عدم موجودگی میں بھی شاگرد اس جگہ نہ بیٹھے اور نہ وہاں پاؤں وغیرہ رکھے؛ چنانچہ تذکرۃ السامع میں علامہ ابن جماعہ نے ذکر کیا ہے:

وَمِنْ تعظيمِ الشيخِ أن لا يجلس إلى جانبه ولا على مُصَلَّاهُ أو وِسَادَتِهِ(۱۴).

ترجمہ: اور استاد کی تعظیم وتکریم میں یہ بھی داخل ہے کہ شاگرد اُن کے پہلو میں نہ بیٹھے اور نہ اُن کے مصلے اور تکیہ پر بیٹھے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ طالب علم کے لیے اپنے اساتذہ کا ادب اور احترام کرنا نہایت ضروری، ان کی بے ادبی و بے توقیری نہایت مُضر ہے، اگرچہ بظاہر ابتداء میں نقصان ظاہر نہ ہو؛ لیکن انجامِ کار صحیح علم کے حصول سے محرومی ہوتی ہے اور علم کی نشر واشاعت کی توفیق بھی نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں طالب علم کے لیے اپنے اکابرین کی ایسی کتب کا مطالعہ مفید رہے گا جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، خصوصاً علامہ برہان الدین زرنوجیؒ کی کتاب تعلیم المتعلم اور علامہ بدر الدین ابن جماعہؒ کی کتاب "تذکرة السامع والمتکلم" نہایت مفید ہیں۔

* * *

حواشی وحوالہ جات

(۱) تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، (9/136)، باب السین، رقم الترجمة: 4750، الناشر: دارالکتب العلمیة- بیروت، ط:1417ھ

(۲) منهاج المتعلم للغزالی، (ص:78)، الناشر: دارالتقوی-دمشق، ط:1431ھ-2010م

(۳) بریقة محمودیة فی شرح طریقة محمدیة للخادمی، (258/3)، الفصل الثالث، الناشر: مطبعة الحلبی

(٤) الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع للخطیب البغدادی، (182/1)، باب تعظیم المحدث وتبجیله، الناشر: مکتبة المعارف - الریاض

(٥) إحیاء علوم الدین للغزالی، (50/1)، کتاب العلم، الباب الخامس فی آداب المتعلم والمعلم، الناشر: دارالمعرفة - بیروت

(٦) تذکرة السامع والمتکلم لابن جماعة، (ص:96)، الباب الثالث، الفصل الثانی، الناشر: دار البشائر الإسلامیة - بیروت، ط:1433ھ-2012م

(۷) تاریخ دمشق لابن عساکر، (401/40)، ترجمة: عطاء بن أبی رباح، رقم:4705، الناشر: دار الفکر- بیروت، ط:1415-1995م

(۸) سیرأعلام النبلاء للذهبی، (86/5)، ترجمة عطاء بن أبی رباح، الناشر: مؤسسة الرسالة - بیروت، ط:1405ھ-1985م

(۹) تذکرة السامع والمتکلم لابن جماعة، (ص:107)، الفصل الثانی فی آدابه مع شیخه

(۱۰) الجامع لأخلاق الراوی آداب السامع للخطیب البغدادی، (185/1)، هیبة الطالب للمحدث، الناشر: مکتبة المعارف - الریاض

(۱۱) تذکرة السامع والمتکلم لابن جماعة، (ص:103)، الفصل الثانی فی آدابه مع شیخه

(۱۲) تذکرة السامع والمتکلم لابن جماعة، (ص:99)

(۱۳) المجموع شرح المهذب للنووی، (37/1)، الناشر: دارالفکر، بیروت

(۱٤) تذکرةالسامع والمتکلم لابن جماعة، (ص:105)، الفصل الثانی فی آدابه مع شیخه

* * *

پڑوسی کے حقوق

از: مولانا محمد راشد شفیع

اسلام ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کی رہنمائی کرتا ہے۔ عبادات کے ساتھ ساتھ اسلام نے اخلاقیات، معاشرت، اور حقوق العباد کو بھی بنیادی اہمیت دی ہے۔ انھیں معاشرتی حقوق میں سے ایک اہم حق ''پڑوسی کا حق'' ہے۔ قرآن کریم اور احادیثِ مبارکہ میں اس رشتے کو نہایت قدر و منزلت حاصل ہے۔ پڑوسی وہ ہوتا ہے جو ہمارے قریب رہتا ہے، ہماری زندگی کے نشیب و فراز، دُکھ سکھ اور حالات کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے؛ اس لیے اسلام نے اس تعلق کو محض رہائش کی بنیاد پر محدود نہیں رکھا؛ بلکہ اس کو محبت، خیر خواہی، اور ایثار کا نمونہ بنایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کا ایمان مکمل ہی نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف سے محفوظ نہ رکھے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صراحت سے فرمایا:

"وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبَیٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ..." (النساء:36)

یعنی قریبی پڑوسی ہو یا اجنبی، دونوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں ایسے ایمان کا انکار کیا گیا ہے جس کا حامل شخص خود تو پیٹ بھر کر کھائے؛ مگر اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ ایسے شخص پر جنت حرام قرار دی گئی ہے جو اپنے پڑوسی کو ایذا پہنچاتا ہے۔

افسوس کہ آج کا معاشرہ ان تعلیمات سے غافل ہو چکا ہے۔ پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، صبر، ہمدردی، اور تحمل کی بجائے جھگڑے، بدگمانی اور قطع تعلق عام ہو چکے ہیں۔ یہ صورتِ حال ایک سوال پیدا کرتی ہے کہ کیا ہم واقعی اسلامی معاشرے کا حصہ ہیں؟.

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالی نے جا بجا پڑوسیوں کے حقوق کو بیان فرمایا ہے، چند آیات

کریمہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱-پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک

ترجمہ:''اللہ کی عبادت کرو،اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ...اور پڑوسی رشتہ دار اور غیر رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو...''(سورۃ النساء:36)

۲-پڑوسی کو ایذاء دینا منع ہے

ترجمہ:''اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بلا وجہ ایذا دیتے ہیں، وہ بہتان اور کھلا گناہ اپنے سر لیتے ہیں۔''(سورۃ الاحزاب:58)

۳-پڑوسی کو بھوکا رکھنا ظلم ہے

ترجمہ:''وہ دوسروں کو خود پر ترجیح دیتے ہیں،اگر چہ خود کو سخت حاجت ہو۔''(سورۃ الحشر:9)

۴-صلہ رحمی وحسن سلوک کی ترغیب

ترجمہ:''یقیناً اللہ عدل،احسان،اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے...''(سورۃ النحل:90)

۵-ایمان کے تقاضے

ترجمہ:''مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''(سورۃ الحجرات:10)

احادیث مبارکہ میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے حقوق کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

۱- حدیث جبریل ووصیت جار:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جبریل علیہ السلام مجھے برابر پڑوسی کے بارے میں وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ پڑوسی کو وارث بنادیا جائے گا۔''(صحیح بخاری:6014،صحیح مسلم:2624)

۲- ایذاء رسانی سے بچاؤ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ کی قسم!وہ ایمان والا نہیں...جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانی سے محفوظ نہ ہو۔''(صحیح بخاری:6016)

۳- پڑوسی کو تحفہ دینے کی ترغیب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''اے مسلم عورتو!پڑوسن کو معمولی چیز کا تحفہ دینا بھی حقیر نہ

جانو، خواہ وہ بکری کا کُھر ہی کیوں نہ ہو۔'' (صحیح بخاری:2566)

۴- کھانے میں شریک کرنے کی تاکید

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب سالن بناؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈال دو اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو!'' (صحیح مسلم:2625)

۵- پڑوسی سے نیکی کا حکم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کرے۔'' (صحیح مسلم:47)

۶- قریبی دروازے والے کو فوقیت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: دو پڑوسی ہوں تو تحفہ کسے دوں؟

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس کا دروازہ تم سے زیادہ قریب ہے۔'' (صحیح بخاری:6021)

اور سلف کے بکثرت واقعات اور اقوال بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام میں پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی کس قدر تاکید ہے۔

۱-حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو وصیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! جب سالن بناؤ تو پانی زیادہ ڈال کر اپنے پڑوسی کو بھی دو۔'' (صحیح مسلم:2625)

۲-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایثار

جب بکری ذبح کرتے تو بار بار غلام سے فرماتے: ''ہمارے یہودی پڑوسی کو گوشت دینا نہ بھولنا!'' (مکارم الاخلاق لابن ابی الدنیا:ص70)

۳-حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے پڑوسی

ایک شخص نے ان کے گھر کی دیوار میں سوراخ کیا؛ مگر انھوں نے کچھ نہ کہا؛ بلکہ فرمایا: ''شاید ان کو روشنی کی ضرورت ہو۔'' (صفۃ الصفوۃ:2/ 95)

۴-خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی تلقین

آپ فرماتے تھے: ''پڑوسی کو بھوکا سونے دینا ظلم ہے، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو!'' (کتاب الزہد لابن المبارک:1165)

خلاصۂ تحریر یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ تبھی فلاح پا سکتا ہے جب اس کی بنیاد حسنِ سلوک، ایثار اور

باہمی احترام پر رکھی جائے۔ پڑوسی کے حقوق کو قرآن وسنت میں جتنی اہمیت دی گئی ہے، وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ایک مسلمان کا کردار صرف عبادات تک محدود نہیں؛ بلکہ سماجی تعلقات کی بہتری میں بھی اہم کردار ادا کرنا لازم ہے۔ پڑوسی چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، قریبی ہو یا اجنبی، اس کا احترام، خبر گیری اور مدد کرنا اسلامی فریضہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کو ایمان کی علامت قرار دیا۔ اگر ہم ان تعلیمات پر عمل کریں تو معاشرے میں رنجشیں، بغض وکینہ اور حسد کی جگہ محبت، رواداری اور بھائی چارگی جنم لے گی۔ ہر گھر ایک امن کا گہوارہ بنے گا اور ہر دل میں دوسروں کا خیال پیدا ہوگا۔ ہمیں چاہیے کہ ان تعلیمات کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں، اپنے بچوں کو سکھائیں، اور معاشرے میں اس شعور کو عام کریں؛ تاکہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ تشکیل پاسکے۔

* * *